بسم اللہ الرحمن الرحیم

کلیاتِ بسمل

سردار سلطان محمود بسمل (مرحوم)

کا

تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام

جمالیات پبلشرز، اٹک

ضابطہ:

اس کتاب کے تمام حقوق بحق سردار ساجد محمود خان محفوظ ہیں

سرنامہ: کلیاتِ سلطان محمود بسمل

شاعر: سلطان محمود بسمل

سرِ ورق: آغا جہانگیر بخاری

تزئین: مدینہ کمپیوٹرز، اٹک

سنِ اشاعت: ۲۰۲۱

منتظم: سید مونس رضا

تعداد کتب: ایک ہزار

قیمت: ۱۲۰۰ روپے

اشاعتی ادارہ: جمالیات پبلشرز، اٹک (پاکستان)

madinacomputerz@gmail.com

انتساب

کلثوم اختر

کے

نام

جس کی پُرعزم رفاقت اور حسین مسکراہٹوں

نے زندگی کے مشکل لمحات میں

مجھے جینے کا حوصلہ دلایا۔

فہرست

ساغرِسم	۴۱
عقیدتیں	۴۱
کب تک مرے زخموں کا مداوا نہ کریں گے	۴۸
مری نگاہ میں ساقی وہ بادہ خوار نہیں	۴۹
تنا ہوا تھا جو اک سائبان آندھی میں	۵۱
تُو جو مجھ کو چھوڑ گیا تھا	۵۳
پھر کسی کا سنگِ در ہے دوستو	۵۵
تیرا جلوہ ہی ہر اک گل میں نمایاں دیکھنا	۵۷
جو پہلے تھا اب اس جیسا نہیں ہے	۵۹
حماقتوں کا، تن آسانیوں کا ڈیرہ ہے	۶۱
خالق کا ہے کمال تجھے اور کیا کہوں	۶۲
دریا تھا وہ تو موج کی صورت گزر گیا	۶۴
زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے	۶۶
سوکھے، بکھرے، خاک ہوئے ہیں	۶۸
سارے رشتے دھن دولت کے	۶۹
قدم قدم پہ نئے گل کھلائے جاتے ہیں	۷۰
کبھی مہکا ہوا گلزار ہے دل	۷۱
گلہ صیاد سے کیسا عدو نکلی زباں میری	۷۳
لُوٹا چمن کو گردشِ لیل و نہار نے	۷۵
میں آج انقلابِ زمانہ سے ڈر گیا	۷۶
نخلِ وفا کو پھولنے پھلنے بھی دیجیے	۷۷
وہ لبِ شیریں	۷۸

ہجر کی شب کو بھی غم خوار نہیں حاصل دوام	۷۹
اس ایک بات پہ یہ دل ہوا ہے سودائی	۸۰
اے جانِ فقیراں پنگھٹ پر	۸۱
اسیرِ جرمِ اُلفت کی پریشانی نہیں جاتی	۸۲
بہم خوشبو، نزاکت، گُل، خمستاں دیکھنے والے	۸۳
بے سروساماں تھے جو کل تک گداؤں کی طرح	۸۴
بجھتے ہوئے چراغ جلاؤ تو بات ہے	۸۵
بات دل کی زباں پہ لا نہ سکے	۸۶
بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا دینے لگے ہو	۸۷
بیٹھے ہیں زیرِ سایہ دیوار دیکھنا	۸۸
بگڑا ہوا نظامِ چمن دیکھتا ہوں میں	۹۰
پُرکیف اب کے رنگِ گلستاں نہ ہو سکا	۹۲
پھر حسرتوں کے دیپ جلایا کروں گا میں	۹۳
تشنہ لب کب سے پڑا ہوں ترے مے خانے میں	۹۴
تری ہر صبح ہے صبحِ درخشاں	۹۵
تیرے لبوں کو چوم لیا ہے	۹۶
تمھارے بعد سکون و قرار کی باتیں	۹۷
تجھ سے اُلجھ کے سر بہ گریباں ہوں کیا کروں	۹۸
جنھیں اپنے اثاثوں کی پڑی ہے	۹۹
جہاں کا رنگِ دگر ہے نہ جانے کیا ہو گا	۱۰۰
جہاں میں ہر کوئی مجھ پر یہی الزام دھرتا ہے	۱۰۲
چھوڑ گئے اب سکھ کے ساتھی دور ہوئی منزل	۱۰۳
حقائق سے جو منہ موڑے ہوئے ہیں	۱۰۴

حالِ دل کہنے سے ہیں معذور ہم ۱۰۵
دشت کو صحرا کو رشکِ گلستاں کہنے لگے ۱۰۶
داغِ غمِ فرقت کو چھپایا نہیں جاتا ۱۰۷
زندگی کیا ہے کبھی جو ذہن میں لاتا ہوں میں ۱۰۸
کل جن کا امتیاز رہی ہیں حماقتیں ۱۱۰
کرتا ہے آج پھر وہ شبِ غم کا تذکرہ ۱۱۲
کلی میں رنگ گلوں پر نکھار تجھ سے ہے ۱۱۳
کیف میں ڈوبی شام کی باتیں ۱۱۵
کیا بھروسہ ہے تیری رحمت کا ۱۱۶
کیسی یہ بہارِ زندگی ہے ۱۱۷
کہتا ہے کہ حق بات کا اظہار کرے گا ۱۱۸
گلستاں کا نکھار تھے کچھ لوگ ۱۱۹
لُٹ ہی گیا دل لٹتے لٹتے ۱۲۰
میں نے بربادیٔ گلشن کو نہ دیکھا ہوتا ۱۲۱
نظر ملا کے اُسے وقفِ اضطراب کیا ۱۲۲
ہوئے منسوب جو مجھ سے ۱۲۳
ہر نئی صورت تری صورت لگے ۱۲۴
ہزار بار تمھیں اپنے گھر بلائیں گے ۱۲۵
ہر ایک شخص یہاں محوِ خود نمائی ہے ۱۲۷
رُخِ روشن سے یوں اُٹھا نقاب آہستہ آہستہ ۱۲۹
چمک رہا ہے لہو کا نشان کاغذ پر ۱۳۰
گلہ رہا نہ زمانے کی سرد مہری کا ۱۳۱
درد سے نا آشنا کوئی یہاں ملتا نہیں ۱۳۲

وہ ایک شخص ملا تھا جو ایک بار مجھے	۱۳۳
بھیس بدل کر پھر آئے ہیں	۱۳۴
آتی ہے یاد اُن کی رفاقت کبھی کبھی	۱۳۵
سکون و راحتِ ہستی سے بیگانہ بنا ڈالا	۱۳۶
وہ دل میں ہے نہ ہے میرے جگر میں	۱۳۷
حق بات کی تو اتنا گنہگار ہو گیا	۱۳۸
اک مہرباں کی جب سے نگاہیں بدل گئیں	۱۳۹
مکینوں سے مکاں خالی پڑے ہیں	۱۴۰
آج پھر اُن کی نظرِ کرم ہو گئی	۱۴۲
ایسا کانٹا چُبھا ہے پاؤں میں	۱۴۳
اُن کو بٹھا کے اپنے مقابل بیاں کروں	۱۴۵
ہر چہرے پر لکھی ہوئی تحریریں پڑھتا رہتا ہوں	۱۴۶
غیر پھرتا ہے اُٹھاتا ہوا طوفاں دیکھو	۱۴۷
قطعات	۱۴۹
زندگی کے میلے میں	۱۸۷
نوائے دل	۲۲۷
مے خانۂ حیات کا کیسا نظام ہے	۲۲۹
جیسے جیسے عمر گزاری جاتی ہے	۲۳۰
تیری اک نگاہ پہ وار نے دلِ بے قرار چلے گئے	۲۳۲
تیری ہر صبح ہے صبحِ درخشاں	۲۳۳
کھلی جو آنکھ دیکھا بندہ پنجرہ	۲۳۴
اک فرشتہ کہ نظر آتا ہے باہر میرے	۲۳۶
اک شخص کچھ نہ تھا تو مرا یارِ غار تھا	۲۳۸

لاریب کہ خود اپنے سے بے زار رہا ہوں	۲۴۰
آنکھیں بند کروں تو ایسا لگتا ہے	۲۴۱
ہے بہت تلخ پر حقیقت ہے	۲۴۳
بیتِ حوادث میں رہتا ہوں	۲۴۴
دیکھتا رہتا ہوں پھر خواب سہانے شب بھر	۲۴۶
اکیلا تابہ کے موجوں سے لڑتا	۲۴۷
دعاؤں میں اثر آتا نہیں ہے	۲۴۸
دیکھ انھیں بھی ایک نظر	۲۴۹
اپنا نسب بدنام نہ کر	۲۵۱
نہ جانے کب سے دھوکے کھا رہا ہوں	۲۵۳
سوچنے بیٹھوں تو پھر اک پل بھی جینا ہے محال	۲۵۵
میرے دل کی دنیا ہے آباد سدا	۲۵۶
کس نے آنچل لہرایا ہے	۲۵۷
رشتہ جو سب سے پیارا ہے	۲۵۸
تلخاب	۲۶۱
قطعات	۲۶۴
خواب میں جنگل	۲۸۱
عقیدتیں	۲۸۴
ایک اک شاخ شعلہ فشاں ہو گئی	۳۰۳
صبح سویرے جتنے بھی اخبار پڑھے	۳۰۵
تھامرے نزدیک ہی دریا بہت	۳۰۶
اک عمر بتائی ہے جس گھر کو بنانے میں	۳۰۸
پھول بکھرے ہیں لالہ زاروں کے	۳۰۹

حُبِ زَر نے اُس کو اندھا کر دیا	۳۱۰
نئی راہوں میں چلنا سیکھنا ہے	۳۱۲
میں اپنے گھر میں ہوں لیکن کچھ ایسا لگتا ہے	۳۱۳
دل کی دھڑکن مدہم ہوتی جاتی ہے	۳۱۴
عجب حال میں ہے طبیعت ہماری	۳۱۵
مرے خالق کا اک اعجاز ہو تم	۳۱۷
نظم، وہ میری بچی	۳۱۸
اک گاؤں ہے چھوٹا سا جو دیکھا لبِ دریا	۳۲۰
امیدوں کا دیپ جلاؤ سال نیا ہے روشن روشن	۳۲۲
یہ زندگی کا کارواں	۳۲۳
میرے قائد میرے محسن	۳۲۶
دل میں اپنا درد چھپائے گیت وطن کے گا تا جا	۳۲۹
ہری شاخوں کو لہرانے لگے ہیں	۳۳۱
ایک لمبا سفر	۳۳۲
محترم دوستو! محترم ساتھیو!	۳۳۸
واپسی کا منظر	۳۴۳
نوحۂ نثار	۳۴۷
ہوئے تمام کئی ماہ و سال آجاؤ	۳۵۱
میرے پیارے بچو!	۳۵۲
آج پھر مستی میں محوِ رقص ہیں سرو و سمن	۳۵۵
شکست و یاد کی ظلمت مٹا کے بڑھتے چلو ۳۵۷	
میں ہوں وہ پھل دار شجر	۳۵۹

دنیا میں اکثر دیکھا ہے ۳۶۰
بند آنکھوں کے تماشا دیکھنا
۳۶۲
دیکھنے میں فقیر ہیں ہم لوگ ۳۶۴
ایک اک کر کے پیاری عیدیں یاد آئیں ۳۶۵
بہاریں جب بھی آئیں گی ۳۶۶
خوشبوؤں کی کتاب ہو جیسے ۳۶۷
بو گیا ہے نفرتوں کے بیج وہ میرے لیے ۳۶۸
بہار آئی ہے دل گھبرا رہا ہے ۳۶۹
میں کہتا ہوں گھر کی حفاظت مشکل ہے ۳۷۱
اپنی بیٹی منزہ کیلئے ۳۷۲
تنوروں سے دھواں جس دم اُٹھا ہے ۳۷۳
اندر باہر ایک ہی جیسا لگتا ہے ۳۷۶
تجھ سے جو بھی نظر ملاتا ہے ۳۷۷
رکھتا ہے کون سب کی خبر اقتدار میں ۳۷۹
البم آج پرانا دیکھا ۳۸۰
اشعار/قطعات ۳۸۱

من آنم

''ساغرِ سم'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ میری ۱۹۵۱ء سے اب تک کی شاعری کا انتخاب ہے۔ تکمیلِ فن شعر کا سفر جاری ہے۔ ''ساغرِ سم'' کی ترتیب اس سفر کا ایک موڑ ہے۔ منزل نہیں ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ماضی کی خوش گوار یادوں کے جھونکے دل ودماغ کو معطر کر دیتے ہیں۔ اٹک کا ادبی پس منظر بہت شاندار رہا ہے۔ ڈاکٹر سعداللہ کلیم صاحب نے اس کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

اٹک میں احباب کی محفلوں میں فنِ شاعری اور ادب کی دیگر اصنافِ سخن پر تنقیدیں میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ میرا شعر کیسا ہے، یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے اور اگر اس مجموعے کے کسی ایک شعر نے بھی آپ کو متاثر کیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

اگر آج اعجاز سلیم، کوثر جعفری اور مرزا اقبال بیگ نعیم زندہ ہوتے تو بہت خوش ہوتے۔ اللہ ان سب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔ ایسے دوست اور ساتھی اب کہاں ہیں۔

میں جناب حکیم حیدر رواسطی مرحوم، جناب پروفیسر ماجد صدیقی، جناب اوصاف احمد خان لودھی، جناب راشد مراد، جناب ملک ظفر اقبال، جناب عزیز ہمدانی، جناب پروفیسر زاہر حسن فاروقی، جناب پروفیسر غلام ربانی فروغ، جناب عبداللہ راہی کا مشکور ہوں جنھوں نے مجھے اپنی پُرخلوص مشاورت عطا فرمائی۔

سردار سلطان محمود بسمل

سلطان محمود بسمل

اُن دنوں اُس خاک پر بارش تھی جیسے نور کی
آنکھ کا سرمہ بنی تھی ریت کیمبل پور کی

میل کلومیٹروں میں بدلے تو جناب عبدالقادر حسن نے لکھا۔میٹرک نظامِ اوزان کے رواج پذیر ہونے سے جہاں تاجر طبقے کوڈنڈی مارنے اور فوری فوائد حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے ہیں، وہاں کچھ لوگوں کو فوری نقصانات کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے اور ان لوگوں میں محض صارفین ہی شمار نہیں ہوتے بلکہ وہ مورخین بھی شامل ہیں جو جذبات واحساسات کی تاریخ لکھتے ہیں اور عرفِ عام میں شاعر کہلاتے ہیں اور میٹرک نظامِ اوزان کے رائج ہونے سے نقصان انھیں یہ ہوا ہے کہ اب وہ اس طرح کے شعر نہیں لکھ سکیں گے۔

طے کرے گی چکور کیا ماجدؔ
چاند تک فاصلہ ہے میلوں کا

اس لیے کہ اب میلوں کی جگہ کلومیٹروں نے لے لی ہے۔

وقت نے پانسہ پلٹا تو شہروں کے نام بھی بدل گئے۔لائل پور، فیصل آباد ہو گیا اور کیمبل پور، اٹک کہلانے لگا۔لیکن جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ۱۹۶۴ء میری زندگی میں دوبارہ

آئے اور میں لائل پور چلا جاؤں یا ۱۹۶۶ء میری زندگی میں لوٹ کر آجائے اور میں کیمبل پور کا رُخ کروں۔ اسی طرح یہ بات بھی اب حدِ امکان سے باہر ہے کہ میں اپنے مذکورہ بالا شعر کو کیمبل پور کے نئے نام کی رعایت سے اُسی لگن کے ساتھ از سرِ نو تخلیق کروں جس لگن کے تحت یہ شعر کہا گیا تھا تاہم میرے دیوان میں اس شعر کی موجودگی اس امر کی دلالت ضرور کرتی ہے کہ اٹک اور اہلِ اٹک سے میری وابستگی ایسی نہیں ہے جسے فراموش کیا جا سکے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ''سُر سنگیت شائع ہو یا لہر لہر دریا'' ''غیر علامتی کہانی'' شائع ہو یا ''کیہہ جاناں میں کون'' مجھے کیمبل پور سے چھپنے والے کسی بھی مجموعۂ نثر و نظم کی اشاعت پر اتنی ہی طمانیت حاصل ہوتی ہے جتنی اپنی کسی کتاب کے چھپنے پر۔ اور میری یہی نسبت اُن رہروانِ راہِ سخن سے ہے جن کا تعلق اٹک سے ہے لہٰذا طے ہے کہ سلطان محمود بسمل سے بھی میرا ناطہ دل و جان کا ہے، لب و زبان کا نہیں۔

یہ اتفاق تھا کہ جن دنوں میں اٹک میں تھا، سلطان محمود بسمل یا تو اٹک سے باہر تھے، یا مجھ پر منکشف نہ تھے اور اُن سے میرا پہلا تعارف محبی آفتاب احمد شاہ کے ذریعے تلہ گنگ میں ہوا۔ اُن سے بعد میں جتنی ملاقاتیں بھی ہوئیں، مشاعروں میں ہوئیں اور اگرچہ اُن ملاقاتوں کا دورانیہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا تھا تاہم بسمل صاحب کی موثر شخصیت ذہانت اور فراخ دلانہ میل ملاپ رفتہ رفتہ دل میں اُترتے گئے اور اب کچھ مدت سے یوں ہے کہ بسمل صاحب اور میں ایک ہی شہر میں ہیں لیکن دونوں جانب عالم کچھ ایسا ہے جیسے میں انھیں ملوں تو میرے ہونٹوں پر یہ شعر ہوتا ہے:

تلاشِ رزق سے ہٹ کر کہیں نہ چلنے دیں
ضرورتیں کہ جو چھالا بنی ہیں پاؤں کا

اور وہ مجھے ملیں تو چھوٹتے ہی کچھ اس طرح کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

میں تیرے لیے ہوں مانتا ہوں
مجھ کو غمِ روزگار بھی ہے

سلطان محمود بسمل کا کہنا ہے کہ شاعری سے اُن کی نسبت اُن دنوں سے ہے جب وہ ضلع اٹک کے ایک گاؤں میں پرائمری جماعتوں کے طالب علم تھے اور اُن کے صاحبِ ذوق ہیڈ ماسٹر انھیں اسمبلی میں اخلاق آموز نظمیں گانے کے لیے خصوصی طور پر تیار کرتے تھے، پھر جب وہ کالج میں آئے تو گورنمنٹ کالج اٹک میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور سید ضمیر جعفری جیسے اصحاب کی چھوڑی ہوئی ادبی روایات اور فتح محمد ملک، شورش ملک، شفقت تنویر مرزا اور منو بھائی جیسے نوجوانوں کی کالج میں موجودگی اُن کی شعری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں بے حد مدد و معاون ثابت ہوئیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اسی دوران میں اُن کی زندگی میں ایک ایسا جذباتی بحران پیدا ہوا جس کے باعث جوانی کے اُن دنوں میں بھی جب ہر نظر مناظر کی تازگی اور ہر خیال حقائق کی دریافت کے لطف میں غرق ہو ہو جاتا ہے۔ زندگی کی ہر رنگینی اُن کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی اور یہ جذباتی بحران اُن کے ایک ہم جولی کی اچانک خودکشی کے واقعہ سے سامنے آیا اور ایک مدت تک آسیب کی طرح اُن کے درپے رہا لیکن اِس بحران نے اتنا ضرور کیا کہ دنیاداری کے بے شمار قابلِ نفرت جذبات سے بسمل صاحب کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پلہ چھوٹ گیا اور وہ ایک آسودہ زندگی گزارنے لگے جس میں آلائشیں کم اور آسائشیں زیادہ ہوتی ہیں۔

سلطان محمود بسمل کی نکلتی قدوقامت اور غزالی آنکھیں اُن کی چھیل چھبیلی جوانی کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کی دعوت بھی دیتی ہے لیکن اگر اس شک کو الفاظ کا روپ مل بھی جائے تو وہ ایسے سوالات کو اپنی اُسی مخصوص مسکراہٹ کی کرنوں میں دبا دیتے ہیں جو مسکراہٹ کسی بھی صاف ستھرا ذہن رکھنے والے شخص کے چہرے کا سنگھار ہوتی ہے۔

سلطان محمود بسمل نے اپنے جذبۂ عشق کو کہیں آزمایا ہے یا نہیں لیکن انھیں اُس جذبے سے یکسر عاری بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس عظیم جذبے کی گرفت میں وہ اب بھی پوری طرح غرق دکھائی دیتے ہیں۔ اضطراب اُن کی طبیعت کا خاصا اور سفرِ عشق اُن کا مستقل نصیبہ۔ وہ اپنے محبوبوں سے دور ہوں تو پارے کی طرح بے چین رہتے ہیں۔ اُن کا کھانا پینا اور ہنسنا مسکرانا حرام ہو جاتا ہے۔ لیکن جونہی انھیں اپنے بندھنوں سے رہائی پانے میں کامیاب ہونے کا موقع میسر آتا ہے، زندگی کی کوئی بھی مصروفیت یا موسم کی کوئی بھی سنگینی اُن کا راستہ نہیں روک سکتی اور احباب کی محفل ہو یا کسی مہربان کی دعوتِ ولیمہ، وہ ہر امرِ ضروریہ کو پسِ پشت ڈال کر پیڑ کے بازوؤں سے پکے ہوئے پھل کی طرح نکل کر یہ جا وہ جا۔ کسی کے ہاتھ بھی نہیں آئے لیکن اُن کا یہ عشق بھی اُن کی طبیعت کی طرح قطعی جداگانہ نوعیت کا ہے۔ وہی عشق جو خون کے رشتوں کا عشق کہلاتا ہے اور عرفِ عام میں جسے شفقتِ پدری کا نام دیا جاتا ہے۔

سلطان محمود بسمل یاروں کے یار ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُن کا کمال یہ بھی ہے کہ اُن کے انھی یاروں میں ایک یار اُن کا منصبی عہدہ بھی ہے لہٰذا جس طرح وہ اپنے کسی حبیب سے آنکھ چرانے کے مرتکب نہیں ہوتے، اسی طرح وہ اپنے منصب سے بھی ہمیشہ یوں منسلک رہتے ہیں جیسے کسی کم بجلی والے علاقے میں الیکٹرک ریگولیٹر کسی ٹی وی سیٹ یا ریفریجریٹر کے ساتھ منسلک رہتا ہے اور کبھی کوئی نخرہ دکھانے کا چارہ نہیں کرتا۔

سلطان محمود بسمل کو غالب اور اقبال کے بعد فیض اور فراز جیسے شعرا سے بھی نسبت ہے لیکن اُن کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح کسی اخبار کے ایڈیٹر کا مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا، اسی طرح فیض اور فراز کے نظریات سے ان کا متفق ہونا بھی ضروری نہیں۔

تاہم وہ بعض پہلوؤں سے اپنے شعری سفر میں اُن سے اکتساب بھی کرتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ فکری محفلوں سے دور رہنے کے باوجود اُن کی اپنی شاعری میں بھی متعدد ایسے نقوش اُبھرنے لگتے ہیں جن کا تعلق محض غمِ ذات سے نہیں ہوتا۔

سلطان محمود بسمل غزل اور قطعہ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں اور نظم کا پیمانہ وہ صرف اُس وقت استعمال کرتے ہیں جب انھیں اپنے وطن یا اپنے عقائد کے حق میں کچھ کہنا ہو لہٰذا وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں، اس میں محض سلاست اور روانی ہی نہیں ہوتی، معنوی گہرائی بھی ہوتی ہے اور کچھ ایسی پرتیں بھی جو کسی بھی شاعر کی انفرادیت کو ابھارتی اور اُسے استوار کرتی ہیں اور اُس کے شعر وسخن کو ایک خاص ذائقہ بخشتی ہیں اور جن کی گواہی اُن کے آیندہ سطور میں دیے گئے اشعار سے ہمیں جا بجا ملتی ہے:

جنھیں اپنے اثاثوں کی پڑی ہے
انھیں کہہ دو قضا سر پر کھڑی ہے

یہ نکتہ جان لیں اہلِ گلستاں
سزا جرمِ ضعیفی کی کڑی ہے

دشمنِ حرفتِ آدمی، آدمی
دوستو! انتہائے ستم ہوگئی

پہلے دھرتی کے روگ ختم کرو
پھر بسیرے کرو خلاؤں میں

وہ میرا کرب کیا جانے کہ جس نے
مرا زخمِ جگر دیکھا نہیں ہے
جو پہلے تھا اَب اس جیسا نہیں ہے
یہ میرے باغ کا نقشہ نہیں ہے

حیات گردشِ پیہم کا نام ہے بسملؔ
بچھڑ کے ملنا ہے اور مل کے پھر بچھڑنا ہے

اُسی نے مجھ کو رُلایا بھی اور ہنسایا بھی
وہ شخص جو مرا قاتل ہے اور مسیحا بھی

ٹوٹ کے اُس دن میں رویا تھا
جس دن مجھ سے تو بچھڑا تھا

یہ کون سی منزل ہے رہِ شوق کی یارو!
بے ساختہ رہزن کو دعا دینے لگے ہو

اک داغ تھا کہ جس کا نشاں تک نہیں رہا
اک زخم تھا کہ گردشِ دوراں سے بھر گیا

کہتا ہے کہ حق بات کا اظہار کرے گا
یہ دل مجھے رسوا سرِ بازار کرے گا

ذروں میں بھی ظہور تری ذات ہی کا ہے
مشکل یہ آپڑی ہے کہ سجدہ کہاں کروں

یہ امتیازِ آقا و محتاج تا بہ کے
یہ نفرتیں دلوں سے مٹاؤ تو بات ہے

اظہارِ حقیقت نہ ہوا آپ سے واعظ
یہ کام تو ہم سا کوئی مے خوار کرے گا

ماجد صدیقی
خیابانِ سرسید کالونی راولپنڈی

خدوخال

گورنمنٹ کالج کیمبل پور جس کو اب گورنمنٹ کالج اٹک کہا جاتا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے بعد غالباً پنجاب کا سب سے پرانا کالج ہے۔ روایت ہے کہ انتخابات جیتنے کی خوشی میں جب سر سکندر حیات مرحوم نے اپنے ضلع کو کوئی انعام دینا چاہا تو کوئی بھلا وقت تھا اور کسی بھلے آدمی کے منہ سے بات نکل گئی کہ یہاں کالج بنا دیا جائے اور پھر کالج بن گیا۔ اس کالج کے عملے میں بڑے بڑے نامی پرنسپل اور پروفیسر رہے۔ جہانگیر، اشفاق علی خان، ایف اے قریشی، کمانڈر ظہور احمد، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، پروفیسر محمد عثمان، شریف کنجاہی اور منیر احمد شیخ۔ کہتے ہیں جہاں سے سیلاب گزر جائے، زمین بہت زرخیز ہو جاتی ہے۔ زمین تو اس ضلع کی ہمیشہ سے زرخیز رہی ہے مگر بارانی ہے، بارش برسے تو ہریالی چھتوں اور دیوراں پر بھی اُگ آتی ہے۔ مذکورہ اساتذہ کے فیضِ تربیت سے یوں تو ہر میدان میں جوہرِ قابل سامنے آتے رہے، لیکن فوج اور ادب میں ''کیمبل پور سکول آف تھاٹ'' خاص طور سے نمایاں رہا۔ جہاں جنرل اختر اور جنرل علی سرفراز اور جنرل اقبال کے علاوہ ایر مارشل نور خان، انور شمیم اور کرامت رحمن نیازی کے حوالے سے کیمبل پور نے زمین، ہوا اور پانیوں پر پاکستان کا پرچم بلند رکھا۔ وہاں سید ضمیر جعفری، منظور عارف، فتح محمد ملک، شورش ملک، منو بھائی، شفقت تنویر مرزا، عنایت الٰہی ملک، خالد، خاور رضوی، انوار فیروز، عبداللہ راہی اور ممتاز مختار جیسے لوگوں نے ادبی فتوحات کی فہرست میں بھی کیمبل

پور کے نام کو نیچے آنے دیا نہ مدھم ہونے دیا۔ سلطان محمود بسمل کا نام بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ وہ زمانوی اعتبار سے عبداللہ راہی، انوار فیروز اور خاور رضوی سے مقدم، سید ضمیر جعفری اور منظور عارف سے موخر تھے۔ ان کا شمار گورنمنٹ کالج کیمبل پور کے اس ادبی ٹولے میں ہوتا ہے جس میں فتح محمد ملک، شورش ملک، عنایت الٰہی ملک، منو بھائی اور شفقت تنویر مرزا نمایاں ہیں جبکہ الطاف جعفری، محمد اعجاز اور نسیم پڑوی ادبی اُفق سے غروب ہو کر علی الترتیب زمینداری، ضلعی سیاست اور تجارت میں دمک رہے ہیں۔ اس وقت ایسا لگتا تھا کہ یہ سارا علمی وادبی قافلہ دوہرے شمسی نظام کی ایک دوسرے سے متصادم کششِ ثقل کے درمیان جیسے ساکت سا ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ دو بظاہر متصادم فکری نظام جن دو ہستیوں کے دم سے قائم تھے، ان کو علمی وادبی دنیا ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور پروفیسر محمد عثمان کے ناموں سے شناخت کرتی ہے۔ پہلا علم وادب کا آفتاب، پچھلے برس اس ظاہری دنیا کے اُفق سے غروب ہو گیا ہے اور دوسرا داتا کی نگری میں آج بھی روشن ہے جس کی کچھ کرنیں کبھی کبھی روزنامہ جنگ کی وساطت سے ہم دور دراز کونوں کھدروں میں بسنے والے لوگوں کو بھی اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔

لوگ تو کہتے ہیں کہ ڈاکٹر برق مرحوم کا تعلق دائیں بازو سے تھا اور پروفیسر عثمان کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف رہا ہے لیکن ذرا گہرا اُتر کر دونوں کے افکار کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ ظاہری تضاد ایک حد تک جا کر ختم ہوتا صاف نظر آتا ہے۔ کیمبل پور کالج کے یہ دونوں عبقری اپنے اپنے راستے سے کچھ دور جا کر اسی بڑے فکری دھارے میں گم ہونے لگتے ہیں جو اللہ کی طرف سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے نوعِ بشر کی پیاس بجھانے اُترا تھا۔ ڈاکٹر برق اپنے علمی خاندانی پس منظر سے نکل کر قرآن اور حدیث کے گہرے مطالعے کے بعد اور پروفیسر عثمان تفہیمِ اقبال کے مقصد سے آگے بڑھتے ہوئے فلسفۂ اسلام

کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوکراسی معاشی ومعاشرتی عدل کے مرکز تک آ پہنچتے ہیں جس نے عالمِ انسانیت کا الفقرفخری کے شعور سے نوازا اور جس میں فقر اپنی تمام تر بوریا نشینی کے باوصف قیصر وکسریٰ کے ایوانوں کو تھرتھرا دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اگر میرا مشاہدہ غلط نہیں تو کیمبل پور دبستان کا ہر رکن دائیں سے اپنے ذہنی سفر کا آغاز کرے یا بائیں سے، بالآخر اسی مرکز پر آن ٹھہرے گا جہاں سے دایاں اور بایاں سب اپنا مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ سلطان محمود بسمل کو بھی اگر آپ دور سے دیکھیں تو تحصیل فتح جنگ کے ایک بڑے زمیندار گھرانے سے متعلق ہونے اور عہدے کے اعتبار سے مجسٹریٹ اختیارات کا حامل ہونے کی بناء پر وہ آپ کو جاگیرداری اور بیوروکریسی کا نمائندہ نظر آئے گا مگر اس ظاہری خول کے اندر جھانک کر دیکھیں تو آپ کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگی جس کے دل میں ہر انسان کے لیے پُرخلوص جذبات، سب کے لیے ایک عمومی دردمندی اور محبت کی فراوانی ہے۔ یہی وہ اندر کا شخص ہے جو اس کی غزل کے دریچوں سے جھانکتا نظر آتا ہے۔

جب فطرت کی آزاد نعمتیں جو سب انسانیت کا حق ہیں، کوئی ایک آدمی یا ایک طبقہ سمیٹ لینا چاہتا ہے تو وہ ضرور احتجاج کرتا ہے۔ جہاں کمزور پر طاقتور کا ہاتھ اُٹھتا ہے تو وہ ضرور آواز اٹھاتا ہے۔ انسانیت میں مظلوم اور ظالم کی تقسیم اور محکوم حاکم کا امتیاز اس کو گوارا نہیں۔ منافقت کو وہ برداشت نہیں کرتا۔ کم ظرف لوگوں سے اس کی نبھ نہیں سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کے اندر کا یہ سچا کھرا آدمی ہی دراصل جملہ انسانی اچھائیوں کی تجسیم اور صحیح انسانی فطرت کی تعبیر ہے اور اسی اندر کے آدمی سے غزل کے رشتے استوار ہوتے ہیں۔ غزل میں جب باہر کا آدمی بولنے لگے وہ اپنے تخلیقی معیار سے گر جاتی ہے۔ بسمل کی ہر غزل میں ہم اس کے اندر کے سچے اور کھرے آدمی سے

متعارف ضرور ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں وہ صرف ایک آدھ جھلک دکھا کراوجھل ہو جاتا ہے اور کسی غزل میں دو چار قدم آگے تک ہمارے ساتھ چلتا ہے۔ اختصار کے لیے میں صرف چند ایک مثالیں پیش کروں گا:

ع: کوئی تو ہو جسے سچ بولنے کا یارا ہو

(یہ مصرعہ اکیلا ہی اتنا اونچا ہے کہ دوسرا مصرع اس کا ساتھ نہیں دے پاتا)

ایسا کانٹا چبھا ہے پاؤں میں
چلنا مشکل ہوا ہے گاؤں میں
کاٹ لو گے جو سایہ دار شجر
کیسے بیٹھو گے ٹھنڈی چھاؤں میں
پہلے دھرتی کے روگ ختم کرو
پھر بسیرا کرو خلاؤں میں

یہ عادی ہوگئی ہیں آدمی کا خون پینے کے
اب ان آباد سڑکوں سے تو ویرانے ہی اچھے ہیں
بھلی لگتی ہے یوں تو ہر نئی شے اس زمانے میں
مگر احباب بسمل جانے پہچانے ہی اچھے ہیں

بے سرو سامان تھے جو کل تک گداؤں کی طرح
تمکنت میں آج ہیں وہ بادشاہوں کی طرح

اُردو غزل کسی بھی دور میں سیاسی شعور سے یکسر محروم نہیں ملے گی۔ یہ الگ بات

ہے کہ قدیم شعرا جن علامتوں اور استعاروں میں اظہار کرتے تھے، زمانوی بُعد کی بنا پر اس کا ابلاغ خاطر خواہ نہیں ہو پاتا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد حالی کے ہاں نسبتاً کم اور اکبر کے ہاں زیادہ واضح صورت میں اس کا اظہار ملتا ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال اور کسی حد تک حسرت، فانی، اصغر، جگر تک کی تمام اُردو غزل اپنے دور کے حالات اور رجحانات کے مطابق سیاسی سوچ کی لہریں باقاعدگی کے ساتھ اپنے اندر محفوظ کرتی چلی آتی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے زیرِ اثر بالخصوص تقسیم ملک کے بعد تک یوں لگتا ہے کہ غمِ جاناں پر غمِ دوراں کا عنصر غالب آ گیا ہے۔ ترجیحات کا یہی رجحان اب تک جاری ہے۔ جدید تر دور میں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر اگرچہ اس سوچ کا واحد محرک نہیں رہا۔ بسمل کی غزل اس سلسلے میں بھی اپنے دور کے رجحانات کا ساتھ دے رہی ہے۔

ہر ایک شخص اسی کی دہائی دیتا تھا
بڑا عجیب سا منظر دکھائی دیتا تھا

محل کے سامنے اک شور تھا قیامت کا
امیرِ شہر کو اونچا سنائی دیتا تھا

شخصی اخلاص اور سیاسی شعور کے علاوہ بعض دوسرے پہلو بھی ایسے ہیں جہاں بسمل نے غزل کی وساطت سے اپنی شناخت کرانے کی کوشش کی ہے اور عام روایتی انداز کے شعرا کی قطار کو توڑا ہے۔ دراصل بسمل کا مسئلہ یہ رہا ہے کہ شاعری میں اپنے جن دوستوں سے صرف مشورے کی حد تک متاثر رہا، مثلاً مرزا نعیم بیگ مرحوم اور جن مہربانوں سے باقاعدہ اصلاح لی، وہ غزل کے روایتی حسن کے رسیا تھے، چنانچہ بسمل کے ہاں بھی غزل کے

جو نئے تیور پڑھنے والے کو متوجہ کرتے ہیں، وہ روایتی خدوخال ہی کے اندر سے ابھرتے ہیں۔اس اعتبار سے ہم بسمل کو ان شعرا کی صف قدیم کی جانب جھکا ہوا رہتا ہے۔ان روایتی خدوخال میں جدید دور کا شعور جہاں جہاں دمکتا ہے، بڑا مزہ دیتا ہے، مثلاً:

منصور تو نہیں ہوں پہ منصور کی طرح
نظارہ ہائے دار ورسن دیکھتا ہوں میں

کچھ حسرتیں ہیں نقش ونگارِ حریمِ دل
اس قصرِ خستہ حال کا درباں ہوں کیا کروں

پوچھیں گے نہ وہ حال اگر اپنی زباں سے
مرجائیں گے اظہارِ تمنا نہ کریں گے

پہلے وہ میرے نام سے بے زار تھا مگر
وردِ زباں ہیں اب مرے اشعار دیکھنا

جملہ حالات وکیفیات اور حسن وجمال کے انداز واطوار کو کسی واحد ماخذ سے وابستہ محسوس کرنا یا خارجی احوال وحادثات کی کثرت کو کسی وحدت کی سمت میں حرکت دینا ہماری اُردو غزل کا ابتدا ہی سے ایک نمایاں فکری رجحان رہا ہے۔بسمل کی وہ پوری غزل جس کا قافیہ، بہار، نکھار وغیرہ ہے۔اس رجحان کی ایک عمدہ مثال ہے۔میں صرف ایک شعر کا ذکر کروں گا۔باقی اشعار آپ خود ملاحظہ فرما کر اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں:

ترے بدن کی مہک ہے صبا کے دامن میں

ہر عندلیبِ چمن، نغمہ بار تجھ سے ہے

آخر میں، مَیں ضلع اٹک کے مقتدر کھٹڑ قبیلے سے متعلق اس شخص کے بارے میں بتا تا چلوں کہ زندگی میں اپنے قبیلے کی مانند بڑے اتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد بھی اس کی فطرت سے ''بوئے سلطانی'' نہیں گئی اور میرے مشاہدے کے مطابق اس خاص پہلو میں یہ اپنے قبیلے کی بڑی درست نمائندگی کر رہا ہے۔ اگر چہ عقیدت کی بنا پر اس نے اس سلطانی کی علت کا رخ نعت کی طرف موڑ دیا ہے، شعر دیکھیں:

درِ سلطانِ عالم کا میں اک ادنیٰ گداگر ہوں
مری فطرت سے بسملؔ بوئے سلطانی نہیں جاتی

اپنی بڑائی کا شعور رکھتے ہوئے اپنے آپ کو کسی بہت بڑی ملکہ، بہت ہی بڑی ہستی کے ساتھ وابستہ کر لینا، اس کے قبیلے کی پہچان بھی ہے اور اس کی اپنی پہچان بھی۔ ''سلطان'' اور ''بوئے سلطانی'' کے باہمی فرق کا جو لوگ تجربہ رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ''سلطانی'' کے دور کا گزر جانا ایک مسلمہ اصول اور ایک تاریخی واقعیت ہے۔ اس لیے معمول کی بات ٹھہری مگر سلطانی جاتے جاتے اپنے پیچھے جو ایک شاہانہ مزاج اور بلند ذہنی معیار چھوڑ جاتی ہے، میرے نزدیک دکھ اور کرب کا بنیادی مآخذ وہی ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کرب کا تجربہ رکھتے ہیں تو ''ساغرِ سم'' کے ذریعے شناخت کرنے میں آپ کو کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے اور اگر آپ اس تجربے سے نہیں گزرے تو بسملؔ کی غزل اس سے متعارف کرانے میں یقیناً آپ کی معاونت کرے گی۔

ڈاکٹر سعد اللہ کلیم

سلطان محمود بسمل کی شاعری کا تناظر

رشید نثار

سلطان محمود بسمل کی شاعری انسانی اعتقاد سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے ایک انسان اور ایک فنکار کی حیثیت سے روحانی عناصر اور زندگی کے سیال مدارج طے کیے ہیں، چنانچہ اُن کی شاعری کا تناظر ایک مثالی تصور ہے جسے عام قاری بھی آسانی سے اپنی ذہنی گرفت میں لے سکتا ہے۔ بنیادی طور پر سلطان محمود بسمل ''انا'' اور عالمِ مثال کا وسیع دائرہ رکھتے ہیں جس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے دائرے وسیع حلقہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کے پس منظر میں ایک منفرد پیکر اپنے قول وافکار پر قائم مضطرب شخصیت دکھائی دیتا ہے۔ یہ مضطرب شخصیت خود سلطان محمود بسمل کی ہے جس نے فطری ہیجان کی روشنی میں، کبھی اشاروں، کبھی کنایوں میں وہ باتیں کہی ہیں جنھیں محض خیال پرست شاعر زبان پر لانے سے ہچکچاتے ہیں۔ اس اعتبار سے سلطان محمود بسمل کسی تحریک سے الگ، کسی فکری تناظر سے مختلف اپنے افکار کو ذہنی سچائی کے تحت بیان کرنے اور اُس پر قائم رہنے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہی سچائی انھیں اپنے عہد کے بہت سے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

جب کوئی انسان احساسِ ذمہ داری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک آدرش بھی جنم لیتا ہے۔ یہ آدرش بعض اوقات مشترک تصورات اور عصری مماثلتوں کی بنا پر پیدا ہوتا ہے مگر جب کسی ذمہ دار ذہن کے بطون میں ایک واضح نقطہ نظر پیدا ہو جائے تو وہ زندگی بھر اسی پر قائم رہتا ہے اور اسی کی سمت اپنا فکری سفر کرتا ہے۔ چنانچہ سلطان محمود بسمل نے بھی سچائی کی وضاحت کے لیے ایک اندازِ نظر کو قبول کیا ہے اور وہ

ہے سماج کے عناصر کی سچائی کی جھلک دکھانا اور سچے جذبات کی ترجمانی کرنا۔ سلطان محمود بسمل اس لحاظ سے محبت، وقار اور صداقت کا ہم نوا ہے اور یہ ہمنوائی انھیں اُن عصری تحریکات کے بہت قریب لے جاتی ہے کہ جن کا مطمع نظر فرد کی انا کا تحفظ اور انسانیت کی بقا کی ضمانت دیتا ہے۔

ہمارا موجودہ عصری زمانہ شدتِ احساس کو رہنما بنا کر زندگی کا سفر طے کر رہا ہے لیکن منزل تک اُن کی رسائی اس لیے معدوم رہتی ہے کہ عصرِ جدید نے اپنی عنان اپنے ہاتھوں میں نہیں رکھی بلکہ دوسروں کے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔ لہٰذا فرد کی بجائے جماعت اور جماعت کی بجائے ایک مخصوص گروہ ایک سانچے میں ڈھل کر عصرِ جدید کی ترجمانی کرتا رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سلطان محمود بسمل نے شعر کہتے وقت یہ بات شعوری طور پر اپنے ذہن میں بسا رکھی تھی کہ انھوں نے فرد کی انفرادیت کے پیشِ نظر نہ صرف نظریات کا طلسم توڑنے کی کوشش کی ہے بلکہ اپنے عہد کی اس ذہنیت کو بھی نشانہ بنایا ہے جس نے صداقتوں کا منہ چڑایا اور جھوٹ کو روا رکھ کر بے اطمینانی اور غیر آسودگی کو پروان چڑھایا ہے۔ سلطان محمود بسمل نے اس ذہنیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی اور نہ ہی حقارت کی نظر ڈال کر اُس سے نفرت کی ہے بلکہ زندگی کے وسیع تجربے کی روشنی میں ایسے ذہنوں کو مدبرانہ پیغام دیا ہے کہ کسی آدرش کے بغیر زندہ رہنا زندگی کے ساتھ فریب کرنا ہے چنانچہ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ سلطان محمود بسمل کیوں شعوری طور پر ایسا رویہ اور اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

سلطان محمود بسمل زندگی کے تناظر میں اور ایک طویل عمر بسر کرنے اور ادب کی تحریکات کو پرکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بیمار داخلیت اور اندھی مقصدیت انسانیت کی کوئی خدمت نہیں کرسکتی۔ آج انسان کا شعوری میلان ابہام اور سستی رومانیت کے خلاف کھُل کر اظہار کی قوت ہے لیکن ہمارے بیشتر شاعر، شاعری کو گورکھ دھندا اور معمہ

بنانے پر تلے ہوئے ہیں لہٰذا شعر میں سچائی کا عنصر غائب ہوتا جارہا ہے اور ایک عجیب قسم کا مصنوعی پن شعر کے داخلی اور خارجی پیکر کو متاثر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

سلطان محمود بسمل کی شاعری، عصرِ جدید کے مصنوعی پن کے خلاف سیدھی سادی انسانی معروضیت اور سچے جذبات کی شاعری ہے جس میں احساسِ نوعیت کے اعتبار سے اور فکر انفرادی تجربے کی روشنی میں شاعری کے موجودہ رویے سے بہت حد تک مختلف ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سلطان محمود بسمل نے حقائق سے بے نیاز ہو کر شعر نہیں کہے اور اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی تحریکات کو بڑی خاموشی سے دیکھا اور اُن کا جائزہ لیا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کو سماجی عناصر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور تجرباتی اعتبار سے یہ کہنا بالکل موزوں ہے کہ بسمل کی شاعری بیدار ذہن اور تنومند جذبے کی شاعری ہے۔

سلطان محمود بسمل کے بہت سے اشعار فردوسِ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ نئے سائنسی تصورات کے برعکس خالص انسانی معاشرے اور ذہنی رشتے سے وابستہ ہیں۔ انسانی معاشرہ خوف، عدم تحفظ میں مبتلا اور مستقبل سے مایوس دکھائی دیتا ہے لہٰذا بے چینی، بے چہرگی اور زندگی سے اکتاہٹ ایک بغاوت کی شکل اختیار کر رہی ہے جبکہ محبت، صداقت اور آدرش کے حصول کے لیے بے شمار رکاوٹیں اور ناکامیاں موجود ہیں لیکن ان رکاوٹوں کی نشاندہی اور ناکامیوں کا تجزیہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا ذہن اخلاقیات اور سماجی آسودگی کے تصور سے آشنا ہو۔ اس صورتِ حال سے سلطان محمود بسمل بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے انھوں نے شاعری میں نہ تو بغاوت کا مژدہ سنایا ہے اور نہ ہی سستی رومانیت کا پیغام دیا ہے بلکہ انھوں نے زندگی کے موجودہ رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے قلندرانہ اور مردانہ لہجے میں بات کی ہے۔ میرے نزدیک اُن کی شاعری کا یہ واصف انھیں زندگی، انسان اور کائنات کے وسیع دامن میں لے جاتا ہے۔ جہاں صداقت کی صدا صاف سنائی دے رہی ہے:

کوئی تو ہو جسے سچ بولنے کا یارا ہو
کہ اب تو جھوٹ کے پرچم اُٹھائے جاتے ہیں

ایسا کانٹا چبھا ہے پاؤں میں
چلنا مشکل ہوا ہے گاؤں میں

کوئی آندھی پر آنے والی ہے
شور کتنا ہے پھر ہواؤں میں

مال کیا کیا بٹا غنیمت کا
اونچی اونچی محل سراؤں میں

پہلے دھرتی کے روگ ختم کرو
پھر بسیرا کرو خلاؤں میں

سرِ بازار جو بے ساختہ حق بات کہتے ہیں
فقیہہ حیلہ جو سے ایسے دیوانے ہی اچھے ہیں

یہ عادی ہوگئی ہیں آدمی کا خون پینے کی
اب ان آباد سڑکوں سے تو ویرانے ہی اچھے ہیں

تاک میں صیاد بیٹھا ہے نشانہ باندھ کر

اہلِ گلشن سوئے دیوار گلستاں دیکھنا

آندھیوں کی زد میں ہے پھر یہ چمن
کچھ تمھیں اس کی خبر ہے دوستو!

بڑھی جاتی ہے پھر تاریکیِ شب
کوئی جگنو نظر آتا نہیں ہے

کسی گھڑے کا نشاں ہے نہ کوئی سوہنی ہے
ہر ایک سمت یہاں پانیوں کا ڈیرہ ہے

سچ بولنے کا یارا، گاؤں میں چلنے کی دشواری، کسی آندھی کی خبر، مال غنیمت کا اونچے محل سراؤں میں تقسیم ہونا، دھرتی کے لوگ فقیہہ حیلہ جو پر طنز، آباد سڑکوں کے عفریت، چمن سے بے نیازی، روشنی کی تلاش اور بنے بنائے راستوں سے ہٹ کر چلنے کی خواہش، یہ سب خیالات خلوص اور سچائی سے عبارت ہیں۔ ان میں گہرا کرب اور زندگی کا دکھ موجود ہے، میرے نزدیک سماجی شعور اور زندگی کا ایک واضح تصور ان اشعار سے مترشح ہوتا ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ سچے جذبات سلطان محمود بسمل کے انفرادی آدرش سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ اُن کے معاشرے کے اجتماعی تصورات کا عکس بھی ہیں۔ لہٰذا سلطان محمود بسمل سچائی کا علم اٹھا کر زندگی کے کارزار میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ یہ اُن کی سچی آرزو ہے اور گرمی اور صداقت کی نمو بھی۔

سلطان محمود بسمل کی شاعری گہرے سماجی شعور کی بنا پر تاریخ کا ایک بنیادی عنصر

بھی بنتا ہے۔ وہ کبھی سماج کے غیر ذمہ دارانہ رویے اور ذاتی تصور کی بنیاد پر زندگی کی الجھنوں اور مسرتوں کی بات بھی کرتے ہیں، چنانچہ پختہ شعور کے تحت ان کا زمینی رشتہ بھی پائیدار اور اہم دکھائی دیتا ہے مثلاً یہ اشعار گھر کی علامت کے تناظر میں پاکستان کا وسیع دائرہ بناتے ہیں:

دست و بازو ہیں مرے، بچے مرے
اپنی بے پایاں مجھے طاقت لگے

ڈھلا جو بخت کا سورج تو یہ ہوا معلوم
وفا شعار تھے اس کے تمام ہرجائی

خلاؤں میں وہ پھٹ جائیں گے آخر
غبارے تم نے جو چھوڑے ہوئے ہیں

مقتل سجائے جاتے ہیں عشاق کے لیے
مصلوب ہو رہی ہیں ابھی تک محبتیں

میرے دکھیا دل کے اندر جھانکو تو اک بار کبھی
بھید کھلیں گے تم پر کیا کیا ماضی کے اس مدفن میں

جنھیں اپنے اثاثوں کی پڑی ہے
انھیں کہہ دو قضا سر پر کھڑی ہے

غم کے زمانے بیت گئے ہیں خوشیوں کی رُت آئی ہے
روز اخباروں میں ایسی تقریریں پڑھتا رہتا ہوں

ان اشعار میں ''گھر'' کے واقعات میں حقیقت نگاری کے ساتھ ایک شدید کرب موجود ہے اور ذمہ دارانہ طرزِ احساس، بلکہ پاکستانیت کی کائنات بھی کہ جس میں سلطان محمود بسمل وسیع تجربوں کے ساتھ زندہ ہیں۔

سلطان محمود بسمل کا والہانہ بیان صداقت اظہار سے ہم آہنگ ہے۔ اس اظہار سے انھیں مسرت ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں موضوع، حسن اور اظہار کو فن کی آماجگاہ بنایا ہے۔ یہ فنی حیثیت بھی بعض علاقاں سے صورت پذیر ہوتی ہے چنانچہ ان کی تمام شاعری میں ذمہ دارانہ کیفیت موجود ہے جسے اہلِ دل اور اہلِ نظر خصوصی طور پر محسوس کریں گے بلکہ وہ لوگ بھی جنھیں رومان پرستی اور موضوع کی سیاسی اور سماجی حالت بہت عزیز ہے۔

ہماری شاعری کا موجودہ عہد بہت سے تجربات کا وارث ہے مگر ایک نامحسوس انقلاب بھی دکھائی دے رہا ہے اور یہی ہمارے ذہنی اور شعوری سوالات کا مثبت جواب بھی ہے، چنانچہ زندگی کے حقیقی تقاضے اور انفرادیت کا اجتماعی پہلو انسانی تصور پرستی کے لیے اُکسا رہا ہے۔ سلطان محمود بسمل نے اس عنصر کو فنی اعتبار سے کرب کی صورت دی جو شعری پیکر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے بعض شعراء نے غم، موت اور دکھ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پوری شاعری کی کیفیت ''مرثیے'' کی سن بن گئی ہے مگر سلطان محمود بسمل نے اظہار، رنگ اور اسلوب میں ایک عجیب ساٹھہراؤ پیدا کر کے اُردو غزل کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔ اس بات کی گواہی درج ذیل اشعار کے مطالعے سے بخوبی ہو جاتی ہے:

بکنے لگا ہے پھر کوئی یوسف ستم زدہ
سجنے لگا ہے مصر کا بازار دیکھنا

جینا شبِ تاریک میں آساں تو نہیں ہے
کچھ اس کا مداوا دلِ بیمار کرے گا

اظہارِ حقیقت نہ ہوا آپ سے واعظ
یہ کام تو ہم سا کوئی مے خوار کرے گا

دیکھو تو ہے ایک پھول دنیا
سمجھو تو کھٹکتا خار بھی ہے

معصوم شگوفوں کا لہو چھپ نہیں سکتا
کیوں ہاتھوں کو اب رنگِ حنا دینے لگے ہو

سفینے ڈوب جاتے ہیں کبھی ساحل تلک آکر
کبھی بپھری ہوئی موجوں سے بھی ساحل اُبھرتا ہے

ان اشعار کے ساتھ ایک غزل ایسی بھی ہے جس کی فنی ابتدا باقی صدیقی نے کی تھی لیکن سلطان محمود بسمل نے چھوٹی سے چھوٹی بحر کا تجربہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ ان کی پوری غزل میں باقی کے رنگ اور اسلوب کی پرچھائیں موجود نہیں بلکہ یہ کہہ کر انھوں نے ایک اعتراف بھی کیا ہے:

بیتے ہوئے دن کتنے رنگیں
جرمِ محبت کتنا سنگیں

ادبی روایت کی پیروی میں ایک خلاق ذہن اپنی راہیں خود تراش سکتا ہے اور نئی روایات کو جنم دے سکتا ہے۔ سلطان محمود بسمل کی شاعری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور بڑے بڑے دکھوں کو گفتگو کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سے ان کی وسعتِ نظر اور شعور کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ غیر جذباتی طور پر وطن کے بارے میں سوچنے اور دکھوں سے رہائی حاصل کرنے کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اُردو شاعری میں یہ انداز شخصی سطح پر بہت سے شعرا کے ہاں موجود ہے لیکن علامتوں کی عمومیت اور غیر مبہم گفتگو کا انداز سلطان محمود بسمل کی اپنی فکری صلاحیت ہے۔

سلطان محمود بسمل کی شاعری تصورات کی آئینہ داری اور حساس ذہن کی نمائندگی کرتی ہے۔ انھوں نے حقیقی سماجی شعور کو حسن کاری کا پیکر بخش دیا ہے اور یہ عنصر ان کی شاعری کا توانا اور جاندار پہلو ہے۔ اسی سے شعریت اور فکر کا امتزاج پیدا ہوتا ہے بلکہ انسان اور کائنات سے محبت کے رجحان کو فروغ ملتا ہے۔ سلطان محمود بسمل اس اعتبار سے اپنے زمانے کے رجحانات کے شاعر ہیں اور جب رجحان MYTH کی طرف سفر کا آغاز کردے اور شاعری ادبی قدر و قیمت کی آواز بن جائے تو اہلِ نظر اسی سے سماجی تاریخ اور تخلیقی آگہی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اظہارِ خیال

ساغرِسم سلطان محمود بسمل کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔غزل اپنی ہیئت میں مختصر گوئی کا ایسا فن ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ اہمیت اور مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ جدید سائنسی ایجادات کی وجہ سے فاصلے سکڑ رہے ہیں۔نت نئی حقیقتوں میں شب و روز اضافہ ہو رہا ہے اور ان کے اظہار کے لیے جس موزوں ذریعہ کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ غزل ہی کا سانچہ ہے جس کا کینوس اس قدر وسعت حاصل کر چکا ہے کہ حسن و عشق کے لطیف جذبات و احساسات سے لے کر سیاسی اور نفسیاتی الجھنوں تک کے نئے نئے پہلو غزل کے اشعار میں بڑی خوب صورتی سے ڈھل جاتے ہیں اور انسانی ذہن کے لیے مستقل جمالیاتی حظ کا ذریعہ بنتے ہیں۔جدید دور کے انسان کی از حد مصروف زندگی میں اب پہلے جیسی طویل نثری و شعری تحریریں پڑھنے کے لیے فرصت کم سے کم ہوتی جاتی ہے مگر اس کم فرصتی کے باوجود اُردو غزل اپنی جاذبیت کو پوری طرح قائم رکھے ہوئے ہے۔

سردار سلطان محمود بسمل نے بھی غزل ہی کو اظہار کے لیے موزوں خیال کیا ہے اور وہ ایسے دور میں غزل کہہ رہے ہیں جس میں شعری ادب کی ہر روایت کو ناقابلِ برداشت بوجھ سمجھ کر سر سے اتار پھینکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔موجودہ دور کے لکھاری کو شاید اس بات کا ابھی کوئی احساس نہیں کہ ماضی سے کٹ کر اسے کیا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ بہر حال وہ اپنے جدید تخلیقی رویے سے کئی خوب صورت الفاظ مسحور کن MYTHS ٹکسالی تراکیب اور لطیف علامات سے محروم ہو چکا ہے۔نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ اور تراکیب

کی بھرمار سے شعری ادب اپنی فطری ملائمت اور روانی کھو کر اجنبی راہوں میں خاک بسر راہی دکھائی دینے لگا ہے۔ کوئی مابعد ادبی روایت اگر تخلیقی اذہان کے لیے مسموم فضا پیدا کرتی ہے تو قلم برداشتہ جدت طرازی بھی بھونڈے تجرباتی رویے کو جنم دیتی ہے جس طرح بہتے پانی میں عکس دھندلے اور نقش بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خشک تجرباتی فضا بھی زندگی کے لطیف جمالیاتی پہلوؤں کو اپنے اصلی رنگوں میں پیش نہیں کر پاتی جس سے قاری اور قلمکار کے درمیان رابطے کی فضا فاصلوں میں بدل کر دھندلانے لگتی ہے۔

مگر سردار سلطان محمود بسمل نہ تو کسی ادبی روایت کی غلامانہ پابندی کے قائل ہیں اور نہ مجرد جدیدیت کا سہارا لے کر شعر کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کے اشعار عام طور پر واضح رنگوں اور تھرکتی روشنیوں کا عکس دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی غزل عام فہم اور ہر قسم کے ابہام سے پاک ہے۔

بسمل اپنے قاری کو کسی قسم کے امتحان میں نہیں ڈالتے۔ اُن کے شعری مطالب الفاظ کی فطری سطح پر لکھے صاف پڑھے جاتے ہیں۔ تہہ میں کہیں کچلے یا مسلے ہوئے نہیں ملتے۔ سردار سلطان محمود بسمل نہ تو کانوں سے دیکھنے کا کام لیتے ہیں اور نہ کبھی آنکھوں سے سونگھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ علامت در علامت الجھاؤ ان کی شاعرانہ طبیعت کے خلاف ہے۔ وہ برملا بات کہنے کے عادی ہیں اور یہی رویہ ان کی غزل میں نکھر کر سامنے آتا ہے۔ سردار سلطان محمود بسمل آج تک کی اُردو غزل کی توانا روایت کا پورا احساس رکھتے ہیں اور جدید غزل کے شعری رجحانات سے بھی نا آشنا نہیں۔

پروفیسر نجمی صدیقی

۲۔سہام راولپنڈی

بسم الله الرحمن الرحيم

ساغرِسم

حمد باری تعالیٰ

شمس وقمر میں جلوہ نما اور کون ہے
تابع ہیں جس کے ارض وسما اور کون ہے

حاجت روا جہاں میں بھلااور کون ہے
یارب تُو ہی بتا کہ خدا اور کون ہے

تیرے سوا ہے کون سزاوارِ بندگی
لازم ہے جس کی حمد وثنا اور کون ہے

پائی ہے جس کے نور سے آنکھوں نے روشنی
بخشی ہے جس نے دل کو ضیا اور کون ہے

زیبا کسے ہے شانِ کریمی جہان میں
عالم میں بحرِ جود وسخا اور کون ہے

ملتا نہیں ہے تیرے سوا کوئی چارہ گر
کرنے کو دردِ دل کی دوا اور کون ہے

بھر دے متاعِ چین سے جو کاسۂ گدا
سُن لے جو بیکسوں کی صدا اور کون ہے

پائیں کہاں سے منزلِ گم کردہ کا سراغ
تاریکیوں میں راہ نما اور کون ہے

ویراں جو بستیاں ہیں بسائیں گے کس طرح
خالق ہمارا تُو ہی بتا اور کون ہے

کس در پہ جا کے بسملؔ عاجز ہو سجدہ ریز
بخشے جو عاصیوں کی خطا اور کون ہے

نعتیہ

رفعتیں پائی ہیں کیا کیا ترے در پر جھک کر
''میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا''

میں گدا ہو کے بھی مخدومِ زمانہ ٹھہرا
''جب سے آقا میں ترے بابِ کرم تک
پہنچا''

○

میرے خوابوں کی تُو ہی تعبیر ہے

میرے لفظوں کی تُو ہی تاثیر ہے

اے شہنشاہِ دو عالم کیا کروں؟
نورِ وحدت کی تُو ہی تنویر ہے

○

صورت بھی حسیں ہے تیری سیرت بھی حسیں ہے
ثانی تیرا آفاق میں واللہ نہیں ہے

گیسو ہیں کہ خوشبو سے معطر ہیں گھٹائیں
چہرہ ہے کہ تابندہ کوئی ماہِ مبیں ہے

کیا ارفع و اعلیٰ ہے مقامِ شاہِ والا
جھکتی درِ اقدس پہ فرشتوں کی جبیں ہے

کرتے ہیں ملائک بھی شب و روز سلامی
کہتے ہیں کہ یہ بارگہِ خسروِ دیں ہے

سایہ تیری رحمت کا ہر اک عاصی کے سر پہ
ہوگا سرِ محشر تیری امت کو یقیں ہے

اس پر بھی ہو اک نظرِ کرم اے میرے آقا!
بسملؔ تیرے دروازے کا ادنیٰ سا مکیں ہے

سلام بحضور امام عالی مقام

السلام اے شاہِ اقلیمِ شرافت السلام
السلام اے منبع رشد و ہدایت السلام
السلام اے پیکرِ صبروقناعت السلام
السلام اے بانیِ رسم شہادت السلام

○

السلام اے مردِ حق! اے محسنِ دینِ خدا
السلام اے رہنمائے منزلِ راہِ وفا
السلام اے مظہرِ ایثار وتسلیم ورضا
السلام اے خُوگرِ آلامِ دشتِ کربلا

○

خوں رلاتی ہے مجھے اُن کم سنوں کی تشنگی
پیاس کے ہاتھوں جو مثلِ ماہیِ بے آب تھے
ہائے وہ غنچے کہ تھے گلزارِ زہراؑ کی بہار
تندیٔ بادِ ستم سے دشت میں بے تاب تھے

○

کربلا میں اَن گنت تجھ پر ستم ڈھائے گئے
جاں نثاروں کے ترے سر تن سے کٹوائے گئے
زینبؑ و کلثوم کے سر سے ردائیں چھن گئیں
لاشۂ معصوم پر شبدیز دوڑائے گئے

○

محسنِ انسانیت کی بیٹیاں صد حیف ہے
سر برہنہ شام کے بازار میں لائی گئیں
جن کے پردے کی نہیں ملتی دو عالم میں مثال
ایک فاجر کے بھرے دربار میں لائی گئیں

ہو سکیں حائل نہ تیری راہ میں دشواریاں
تو سراپا عزم واستقلال کی تصویر ہے
روشنی بن کر تُو ابھرا ہے شبِ ظلمات میں
شمعِ بزمِ رسالتؐ کی تُو ہی تنویر ہے

تُو نے زندہ کردیا رسمِ خلیل اللہ کو
تیری قربانی بنی مشعل زمانے کے لیے
تُو نے ثابت کردیا اہلِ جہاں پر اے حسین
کربلا لازم ہے باطل کو مٹانے کے لیے

پھر یزیدیت ہوئی دنیا میں سرگرمِ عمل
آج پھر دینِ محمد مصطفیٰؐ مجبور ہے
سازشوں کے دام پھیلائے گئے ہیں جابجا
قومِ مسلم کفر کے نرغے میں پھر محصور ہے

○

آج پھر باطل کی زد میں ہے میری ارضِ وطن
اس کو ہر جانب سے گھیرے لشکرِ کفار ہے
اے شہیدِ کربلا! اے شاہِ دوراں المدد
آج باطل حق سے پھر آمادۂ پیکار ہے

○

کب تک مرے زخموں کا مداوا نہ کریں گے
کیا وہ دلِ بیمار کو اچھا نہ کریں گے

شکوہ نہ کریں گے کبھی نالہ نہ کریں گے
ہم کاتبِ تقدیر کو رسوا نہ کریں گے

پوچھیں گے نہ وہ حال اگر اپنی زباں سے
مر جائیں گے اظہارِ تمنا نہ کریں گے

دیوانہ مجھے کہتے ہیں سب لوگ تمھارا
دیوانے کو یہ اور بھی دیوانہ کریں گے

بے کیف ہے بسملؔ مگر اس جینے کی خاطر
کیا کیا نہ کیا آپ نے کیا کیا نہ کریں گے

مری نگاہ میں ساقی وہ بادہ خوار نہیں
کہ جس کو حرمتِ بادہ کشی سے پیار نہیں

ہوا نہ پھر کبھی روشن سرِ مزار دِیا
کسی کی یاد میں اب کوئی بے قرار نہیں

تمھارا نام بھی لکھا ہے میرے اعدا میں
بجز تمھارے مرا کوئی غم گسار نہیں

اے ساکنانِ کراچی تمھارے ماتم میں
وہ آنکھ آنکھ نہیں ہے جو اشک بار نہیں

ہمی نے سینچا ہے اپنے لہو سے گلشن کو
ہمی کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ستم تو یہ ہے کہ میرا وکیل ہے وہ شخص
کہ جس کی بات پہ لوگوں کو اعتبار نہیں

یہ بات کون کہے باغبان سے بسملؔ
شجر کھڑا ہے مگر اس پہ برگ و بار نہیں

○

تنا ہوا تھا جو اک سائبان آندھی میں
اب اس کو ملتا نہیں ہے نشان آندھی میں

لرز رہے ہیں تھپیڑوں سے دشت وصحرا بھی
اُجڑ نہ جائے مرا گلستان آندھی میں

پڑے ہیں ماند اندھیرے میں چاند تارے

بھی
دکھائی دیتا نہیں آسمان آندھی میں

گرا تھا ایک پرندہ شکستہ پر ہوکر
اُڑا نہ پھر کوئی اونچی اڑان آندھی میں

لٹا ہوں میں بھی مگر بچ نہ پائے گا وہ بھی
سجائی جس نے ہے اپنی دکان آندھی میں

نہ جانے نیند سے کب میرِ کارواں جاگے
بھٹک گیا ہے مرا کاروان آندھی میں

تمھارا گھر ہی سلامت ہے اب تلک ورنہ
بچا نہ ایک بھی اب تو مکان آندھی میں

بڑا ہی عزم بڑا حوصلہ ہے بسملؔ کا
کہ جی رہا ہوں ابھی خستہ جان آندھی میں

○

اب تجھ سے نہیں کوئی شکایت
اس حد سے نکل گیا ہوں جیسے
کچھ تُو بھی بدل گیا ہے لیکن
کچھ میں بھی بدل گیا ہوں جیسے

○

تُو جو مجھ کو چھوڑ گیا تھا
جانے میں پھر کیوں زندہ تھا

ٹوٹ کے میں اُس دن رویا
تھا
جس دن تو مجھ سے بچھڑا تھا

باہر گہرا سناٹا تھا
کوئی اندر بول رہا تھا

میں تو آنکھوں سے اندھا تھا
تُو تو سب کچھ دیکھ رہا تھا

میں تجھ کو دیکھے جاتا تھا
تو بھی مڑ مڑ کے تکتا تھا

تیری آنکھوں میں آنسو تھے
اور میں بھی کھویا کھویا تھا

گاؤں میں اک بھیڑ لگی تھی
میر گھر اُجڑا اُجڑا تھا

○

پھر کسی کا سنگِ در ہے دوستو
اور مرا شوریدہ سر ہے دوستو

زندگانی اک مسلسل کرب ہے
موت اَن دیکھا سفر ہے دوستو

جیسے صحرا میں کھڑا ہوں رات دن
جیسے اب یہ میرا گھر ہے دوستو

آندھیوں کی زد میں ہے پھر یہ چمن
کچھ تمھیں اس کی خبر ہے دوستو!

ہر کوئی معصوم کہلائے یہاں
ہر کوئی مجرم مگر ہے دوستو

تم اسے چاہے کوئی بھی نام دو
میری جنت میرا گھر ہے دوستو

سائباں آتا نہیں کوئی نظر
دھوپ تاحدِ نظر ہے دوستو

وہ سرِ بازار جو لُوٹا گیا
بسملِؔ آشفتہ سر ہے دوستو

○

تیرا جلوہ ہی ہر اک گل میں نمایاں دیکھنا
اور بس اس کے سوا کیا ہے گلستاں دیکھنا

کس طرح ممکن ہے اُن کی کج نگاہی کا علاج
جن کی قسمت میں ہے کافر کو مسلماں دیکھنا

کتنے سادہ ہیں مرے احباب جو اغیار کو
چاہتے ہیں بزمِ ساقی میں نمایاں دیکھنا

تاک میں صیاد بیٹھا ہے نشانہ باندھ کر
اہلِ گلشن سوئے دیوارِ گلستاں دیکھنا

شیوۂ عشاق ہے یا شوقِ منزل کا فسوں
جادۂ اُلفت کی ہر مشکل کو آساں دیکھنا

بہہ رہی ہیں ندیاں مقتل میں ناحق، جابجا
کس قدر ارزاں ہوا خونِ شہیداں دیکھنا

ہر نیا دن جانے والے دن پہ ہے ماتم کناں
زندگی اپنی ہے وقفِ یاس وحرماں دیکھنا

جانے والوں کی جدائی میں تڑپنا رات دن
دوستو! بسملؔ کا یہ حالِ پریشاں دیکھنا

جو پہلے تھا اب اس جیسا نہیں ہے
یہ میرے باغ کا نقشہ نہیں ہے

مرا اُس سے کوئی رشتہ نہیں ہے
مگر وہ غیر بھی لگتا نہیں ہے

چمن کی سرحدیں جس نے گھٹا دیں
چمن کا باغباں لگتا نہیں

برہنہ ہر شجر ہونے لگا ہے
ہرا اب ایک بھی پتہ نہیں ہے

وہ مجھ سے روٹھ کے جاتا نہ ہرگز
کسی نے اُس کو سمجھایا نہیں ہے

جو اک پل بھی کبھی بچھڑے نہیں تھے
اُنھیں مدت ہوئی دیکھا نہیں ہے

جہاں نفرت کی دیواریں کھڑی ہیں
مرے آنگن کا وہ رستہ نہیں ہے

وہ میرا کرب کیا جانے کہ جس نے
مرا زخمِ جگر دیکھا نہیں ہے

ستم گر نے ہزاروں گھر اُجاڑے
کسی نے بھی اُسے ٹوکا نہیں ہے

مآلِ سخت گیری دیکھ کر بھی

جفاؤں سے وہ باز آیا نہیں ہے

بڑھے جاتی ہے پھر تاریکیِ شب
کوئی جگنو نظر آتا نہیں ہے

جہاں بھر اُس کو اپنا جانتا ہے
مگر وہ شخص بسملؔ کا نہیں ہے

○

حماقتوں کا ہتن آسانیوں کا ڈیرہ ہے
اجاڑ شہر میں ویرانیوں کا ڈیرہ ہے

ندامتوں کے طمانچے جمے ہیں گالوں پر
دل ونظر میں پشیمانیوں کا ڈیرہ ہے

یہ کس مقام پہ ٹھہرا ہے کاروانِ حیات
ہر اک نگاہ میں حیرانیوں کا ڈیرہ ہے

کسی گھڑے کا نشاں ہے نہ کوئی سوہنی ہے
ہر ایک سمت یہاں پانیوں کا ڈیرہ ہے

کھِلے تھے پھول جہاں، چاہتوں کا گلشن تھا
اب اُس مقام پہ ویرانیوں کا ڈیرہ ہے

○

خالق کا ہے کمال تجھے اور کیا کہوں
اے پیکرِ جمال تجھے اور کیا کہوں

سارے جہاں میں تجھ سا نہ ہوگا کوئی حسیں
تیری نہیں مثال تجھے اور کیا کہوں

بدلی تری نظر تو زمانہ بدل گیا
جینا ہوا محال تجھے اور کیا کہوں

دیکھا تھا مسکرا کے مجھے اور تُو نے پھر
پوچھا نہ میرا حال تجھے اور کیا کہوں

وردِ زباں ہے نام ترا اور ہر گھڑی
دل میں ترا خیال تجھے اور کیا کہوں

وہ وسوسے جو غیر نے ڈالے ہیں میری جاں!
دل سے انھیں نکال تجھے اور کیا کہوں

فرقت کا ایک پل بھی گوارہ نہ تھا پر اب
گزرے ہیں ماہ وسال تجھے اور کیا کہوں

دریا تھا وہ تو موج کی صورت گزر گیا
میں عمر بھر کی پیاس لیے دیکھتا رہا

تابِ جمالِ یار کا تھا کس میں حوصلہ
برقِ نگاہِ ناز سے دل میرا جل اُٹھا

ممکن نہ تھا کہ شور میں سنتا مری صدا
فرصت کہاں تھی اس کو مری سمت دیکھتا

مجھ سا تو بدنصیب نہ تھا کوئی دوسرا
لیکن وہ اوجِ بخت میں اپنی مثال تھا

تھی اُس کو کیا غرض کہ مرا حال پوچھتا
میں نے تو بس یونہی اسے اپنا سمجھ لیا

اُس پر نثار سارے جہاں کی صباحتیں
چہرہ ہے اُس کا جیسے چمن ہے کھلا ہوا

آیا وہ بام پر تو فضائیں مہک اُٹھیں
قدرت نے نکہتوں کا خزانہ لٹا دیا

آتا ہے یاد آج بھی بسملؔ وہ بے حساب
دیکھے تھا جس کو ایک زمانہ گزر گیا

○

زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے
مرے محبوب تُو کتنا حسیں ہے

زمانہ لاکھ حائل درمیاں ہو

مجھے تیری محبت کا یقیں ہے

چلے تھے چھوڑ کر تم جس جگہ پر
ابھی تک قافلہ دل کا وہیں ہے

چمن کچھ اس طرح ویراں ہوا ہے
نشانِ لالہ و گل بھی نہیں ہے
مری آہوں میں سوزِ غم نہاں ہے
مرا نغمہ نوائے آتشیں ہے

دو عالم کا سکوں حاصل ہے مجھ کو
مری مطلوب چشمِ سرگیں ہے

وہ بسملؔ جو کبھی تھا جانِ محفل
سنا ہے اِن دنوں خلوت نشیں ہے

○

سوکھے، بکھرے، خاک ہوئے ہیں پھول سہانے گلشن کے
اک اک کر کے بچھڑ رہے ہیں ساتھی سارے بچپن کے

کس کی آس میں بیٹھے ہو تم، کیوں آنکھیں بھر آئی ہیں
کس کی یاد میں چھم چھم برسے کالے بادل ساون کے

چیت بیساکھ کا موسم آیا سرسوں پھولی کھیتوں میں
یاد کسی کی جاگ اُٹھی پھر زخم ہوئے تازہ من کے

جب سے تم نے پھیری آنکھیں جاں اُجڑی، دل راکھ ہوا

تب سے یونہی سنسان پڑے ہیں سارے رستے آنگن کے

میرے دُکھیا دل کے اندر جھانکو تو اک بار کبھی
بھید کھُلیں گے تم پر کیا کیا ماجی کے اس مدفن کے

کون گرائے بجلی بسملؔ کون جلائے من تیرا
کون بھلا یہ راز بتائے ،کون ہے پیچھے چلمن کے

○

سارے رشتے دھن دولت کے پیار کا کچا ناطہ ہے
پیار کا مان نہ کرنا پیارے، پیار اک سندر دھوکا ہے

یہ جیون ہے دُکھ ساگر، پگلے تو کس دھیان میں ہے
کون ہے جس نے اس ساگر سے سکھ کا موتی پایا ہے

غم کی اندھیاری راتوں میں یاس کی جب یلغار ہوئی

تیرا چہرہ آس کا تارا بن کراس دم چمکا ہے

رہزن فطرت لوگ مکرم اپنے دیس میں کہلائے
اَنہونی باتوں کا اب کے ہم نے ہونا دیکھا ہے

وہ جو اُس کا اپنا تھا سو وہ بھی اُس کو چھوڑ گیا
اور اب اس کی یاد میں بسملؔ کھویا کھویا رہتا ہے

○

قدم قدم پہ نئے گل کھلائے جاتے ہیں
وہ ہر طرح سے ہمیں آزمائے جاتے ہیں

ہزار ہم سے وہ دامن چھڑائے جاتے ہیں
دل ونگاہ میں پھر بھی سمائے جاتے ہیں

خبر نہیں تجھے واعظ، یہ بزمِ ساقی ہے

یہاں چراغ نہیں، دل جلائے جاتے ہیں

کوئی تو ہو جسے سچ بولنے کا یارا ہو
کہ اب تو جھوٹ کے پرچم اُٹھائے جاتے ہیں

○

کبھی مہکا ہوا گلزار ہے دل
کبھی اک وادیٔ پُرخار ہے دل

کبھی دیکھا اسیرِ زلفِ جاناں

کبھی وقفِ لب ورخسار ہے دل

کبھی ہے صورتِ خورشید ظاہر
کبھی گنجینۂ اسرار ہے دل

کبھی تسلیم وعجز وانکساری
کبھی خنجر، کبھی تلوار ہے دل
کبھی مائل ہوا جور وستم پر
کبھی بے بس کبھی لاچار ہے دل

کبھی ہے ترجمانِ زہد وتقویٰ
کبھی زاہد کبھی مے خوار ہے دل

گلہ احباب سے کیسے ہو بسملؔ
مجھے تو باعثِ آزاد ہے دل

○

گلہ صیاد سے کیسا عدو نکلی زباں میری
اسیری کا مری باعث ہیں خوش الحانیاں میری

نچوڑو لالہ و گل کو تو ٹپکے گا لہو میرا

لکھی ہے گلستاں میں ہر کلی پر داستاں میری

ستم ہائے زمانہ، دردِ الفت، خوفِ رسوائی
ہزاروں غم سہے جاتی ہے جانِ ناتواں میری

مرے حالِ پریشاں پر نہ یارو مسکراؤ تم
تمھیں شاید نہیں معلوم کچھ مجبوریاں میری

خدا سے بے نیازی، ناخداؤں کو خدا کہنا
کسی دن مجھ کو لے ڈوبیں گی یہ نادانیاں میری

شکستہ بال و پر ٹوٹے ہوئے تنکے نشیمن کے
"چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں
میری"

پکار اٹھے ہیں وہ بے ساختہ ہائے مرا بسملؔ
قیامت ڈھا گئی ہے اُن پہ مرگِ ناگہاں میری

لُوٹا چمن کو گردشِ لیل ونہار نے
کیا گُل کھلائے آمدِ فصلِ بہار نے

شکوہ عدو سے ہے نہ مقدر سے ہے گلہ
دھوکے دیے ہیں مجھ کو ترے اعتبار نے

بسملؔ تھی اپنی زیست مثالِ شبِ الم
آئے تھے ہم جہاں میں یہی شب گزارنے

○

میں آج انقلابِ زمانہ سے ڈر گیا
وہ میرے سامنے سے جھکا کر نظر گیا

جلتا ہوا چراغِ تمنا بجھا گیا
قلب وجگر میں آگ لگا کر گزر گیا

شکوہ کسی سے اور نہ شکایت کسی سے ہے
مجھ کو مرا خلوص ہی بدنام کر گیا

سجدوں کا کچھ شمار نہ درباں کے پاس تھا
میں اضطرابِ شوق میں حد سے گزر گیا

اک داغ تھا کہ جس کا نشاں تک نہیں رہا
اک زخم تھا کہ گردشِ دوراں سے بھر گیا

مدت سے جل رہا تھا محبت کی آگ میں
اچھا ہوا کہ بسملِؔ ناشاد مر گیا

○

نخلِ وفا کو پھولنے پھلنے بھی دیجیے
دل میرا جل اُٹھا ہے تو جلنے بھی دیجیے

پھر چار سُو فضا میں ہے تاریکیوں کا راج
دستورِ کائنات بدلنے بھی دیجیے

لینے کو گلستاں میں ہے اک صبحِ نو جنم
اس کربناک رات کو ڈھلنے بھی دیجیے

طے کی ہیں کتنی منزلیں میدانِ حشر تک
ربِ کریم! مجھ کو سنبھلنے بھی دیجیے

گزری اُمیدِ وصل میں بسملؔ تمام عمر
دل سے خیالِ دوست نکلنے بھی دیجیے

○

وہ لبِ شیریں
باعثِ تسکیں

بیتے ہوئے دن
کتنے رنگیں

وہ رخِ تاباں
اخترِ سیمیں

اُڑتے آنچل
رنگیں رنگیں

جرمِ محبت
کتنا سنگیں

○

ہجر کی شب کو بھی غم خوار و نہیں حاصل دوام
ہاں مگر ظالم بڑی مشکل سے ہوتی ہے تمام

دو قدم تو ساتھ میرا دیجیے بہرِ خدا
رہ گئی ہے داستانِ عشق میری ناتمام

کم نہیں ہوتی کسی صورت بھی حسرت دید کی
دیکھتا ہوں اُس بتِ نامہرباں کو صبح و شام

اور بڑھ جاتی ہے میری اُس گھڑی دیوانگی
جب نظر آتا نہیں مجھ کو مرِا ماہِ تمام

آپ کے در پر کوئی بسملؔ تماشا بن گیا
دیکھیے جھک کر ذرا آجایئے بالائے بام

O

اس ایک بات پہ یہ دل ہوا ہے سودائی
جو رات بیت گئی پھر نہ لوٹ کر آئی

کسی کی یاد میں سر کو جھکائے بیٹھا ہوں
بہت عزیز ہے جلوت سے مجھ کو تنہائی

میں شہر شہر پھرا، گاؤں گاؤں گھوم آیا
ملا نہ کوئی بھی اہلِ ہنر کا شیدائی

ڈھلا جو بخت کا سورج تو یہ ہوا معلوم
وفا شعار تھے اس کے تمام ہرجائی

لگائے بیٹھا ہوں صحرا میں سایہ دار شجر
کوئی تو ہوگا گھنی چھاؤں کا تمنائی

یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے بسملؔ
کسی کو پیار ملا ہے کسی کو رسوائی

○

اے جانِ فقیراں پنگھٹ پر یوں آنا جانا ٹھیک نہیں
تم اپنی جگہ معصوم سہی پھر بھی یہ زمانہ ٹھیک نہیں

مانا کہ حقیقت کچھ بھی نہیں تسلیم کہ دنیاداری ہے
پھر بھی یہ زمانہ نازک ہے گھر غیر کے جانا ٹھیک نہیں

کیا تم نے کہا ہے غیروں سے کیوں رازِ محبت چھپ نہ سکا
نادان! محبت کی باتیں غیروں کو سنانا ٹھیک نہیں

اک شور سا ہے مے خانے میں کچھ رند بگڑ کر کہتے ہیں
نظروں سے پلا تُو اے ساقی! شیشے سے پلانا ٹھیک نہیں

بسملؔ تو تڑپ کر مر بھی گیا کیا تیرِ نظر نے کام کیا
قربان ترے قاتل پھر بھی کہہ دے کہ نشانہ ٹھیک نہیں

○

اسیرِ جرمِ اُلفت کی پریشانی نہیں جاتی
بہار آئی مگر اس دل کی ویرانی نہیں جاتی

ستم کچھ اس قدر اک مہرباں صورت نے ڈھائے ہیں
کہ اب اپنی ہی صورت مجھ سے پہچانی نہیں جاتی

تمہی نے گلستاں لُوٹا، گلوں سے جھولیاں بھر لیں
مگر پھر بھی تمھاری تنگ دامانی نہیں جاتی

ڈبویا ناخداؤں نے ہمیں معلوم ہے لیکن
کچھ ایسا حادثہ گزرا کہ حیرانی نہیں جاتی

درِ سلطانِ عالم کا میں اک ادنیٰ گداگر ہوں
مری فطرت سے بسملؔ بوئے سلطانی نہیں جاتی

○

بہم خوشبو، نزاکت، گل، خمستاں دیکھنے والے
مرے محبوب کو دیکھیں گلستاں دیکھنے والے

کسے دیکھا ہے؟ کیوں نادم ہیں سب، مہر و مہ و انجم
کبھی سوچا بھی ہے اے ماہِ کنعاں دیکھنے والے!

یہ ضعف و ناتوانی اور یہ داغِ جگر کی لو
ادھر بھی اک نظر جشنِ چراغاں دیکھنے والے!

غرور اتنا نہ کر حسنِ جوانی عارضی شے ہے
سن ،آئینے میں اپنا روئے تاباں دیکھنے والے

پریشاں حال پھرتے ہیں سکونِ قلب کی خاطر
پشیماں ہیں، مرا حالِ پریشاں دیکھنے والے

○

بے سروساماں تھے جو کل تک گداؤں کی
طرح
تمکنت ہے آج اُن کی بادشاہوں کی طرح

جن سے تھی اُمیدِ غم خواری بہ ہنگامِ الم
دیکھتے ہیں وہ مجھے ناآشناؤں کی طرح

میں کہ دیوانہ ہوں یارو کچھ تو سمجھاؤ مجھے

پوجتے ہیں لوگ کیوں اس کو خداؤں کی طرح

تھے بہت مخلص مرے احباب پہلے تو مگر
اب چرا لیتے ہیں آنکھیں رہنماؤں کی طرح

بھوک، بیماری کا چکر ہے یہاں بھی روز و شب
شہر بھی ویراں ہوا ہے میرے گاؤں کی طرح

گہ گلوں کی انجمن ہے گاہ خاروں کا ہجوم
زندگی اپنی ہے بسملؔ دھوپ چھاؤں کی طرح

○

بجھتے ہوئے چراغ جلاؤ تو بات ہے
پھر بزمِ کائنات سجاؤ تو بات ہے

کب تک رہے گا تذکرۂ داستانِ غم

پیغامِ انبساط سناؤ تو بات ہے

یہ اہتمامِ بادہ و ساغر بجا، مگر
ہر تشنہ لب کی پیاس بجھاؤ تو بات ہے

یہ امتیازِ بندہ و آقا کہاں تلک
یہ تفرقے دلوں سے مٹاؤ تو بات ہو

بسملؔ یہی ہے شیوہ مردانِ حق شناس
خود کو رہِ خدا میں مٹاؤ تو بات ہے

○

بات دل کی زباں پہ لا نہ سکے
قصۂ غم انھیں سنا نہ سکے

شرم ایسی کہ وہ قیامت تک
شکل اپنی ہمیں دکھا نہ سکے

ایسے گھائل ہوئے کہ ہم یارو

فصلِ گل میں بھی مسکرا نہ سکے

جب سے دیکھا جمالِ پیرِ مغاں
ایک پل بھی سکون پا نہ سکے

لاکھ کوشش کے باوجود اے دوست!
یاد دل سے تری بھلا نہ سکے

حالِ بسملؔ وہ پوچھنے آئے
پردۂ رخ مگر اُٹھا نہ سکے

○

بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا دینے لگے ہو
کیوں پیار سے پھر مجھ کو صدا دینے لگے ہو

یہ کون سی منزل ہے رہِ شوق کی یارو!
بے ساختہ رہزن کو دعا دینے لگے ہو

کیوں کرتے ہو، تاراج تمناؤں کا گلشن

گل چیں کے تصرف میں صبا دینے لگے ہو

معصوم شگوفوں کا لہو چھپ نہیں سکتا
کیوں ہاتھوں کو اب رنگِ حنا دینے لگے ہو

کرتے ہو بھری بزم میں کیوں مجھ کو ملامت
کیا میری وفاؤں کا صلہ دینے لگے ہو؟

جاں دینے پہ آمادہ نظر آتے ہو بسملؔ
کیا چیز ہے جو راہِ خدا دینے لگے ہو

○

بیٹھے ہیں زیرِ سایۂ دیوار دیکھنا
بامِ بلند سے مری سرکار دیکھنا

اے رہروانِ شوق، خبردار دیکھنا

رہزن بنا ہے قافلہ سالار دیکھنا

بکنے لگا ہے پھر کوئی یوسف ستم زدہ
سجنے لگا ہے مصر کا بازار دیکھنا

ہر بوالہوس ہے مسندِ شاہی پہ جلوہ گر
بربادیٔ جہان کے آثار دیکھنا

ایجاد کرنے والے ستم ہائے نو بہ نو
تاثیرِ نالہ ہائے شرر بار دیکھنا
پہلے وہ میرے نام سے بیزار تھا مگر
وردِ زباں ہیں اب مرے اشعار دیکھنا

آئے جلو میں اُس کی بہاروں کے قافلے
اس مہ جبیں کی شوخیِ رفتار دیکھنا

بسملؔ کہ ایک رندِ خرابات تھا کبھی
اب فکرِ زہد میں ہے گرفتار دیکھنا

○

بگڑا ہوا نظامِ چمن دیکھتا ہوں میں

ہر سُو ہجومِ رنج و محن دیکھتا ہوں میں

ایسی چمن میں فتنہ و شر کی لگی ہے آگ
آتش بجانِ سرو وسمن دیکھتا ہوں میں

باقی کہاں ہے اب گل و لالہ میں رنگ و بو
بے رنگ و آگ روئے چمن دیکھتا ہوں میں

گل ہے اگر اُداس تو بے کل ہے شاخِ گل
مجروح پنکھڑی کا بدن دیکھتا ہوں میں

اہلِ ہوس نے مل کے قیامت ہے دوستو!
لُوٹی ہے آبروئے چمن ،دیکھتا ہوں میں

منصور تو نہیں ہوں پہ منصور کی طرح
نظارہ ہائے دار ورسن دیکھتا ہوں میں

تاریکیوں کے شہر میں بسملؔ نہ جانے کب

پھوٹے گی روشنی کی کرن دیکھتا ہوں میں

○

پُرکیف اب کے رنگِ گلستاں نہ ہوسکا
تم سے بھی اہتمامِ بہاراں نہ ہوسکا

تزئینِ بزمِ یار بہت خوب تھی مگر

پیدا نشاطِ روح کا ساماں نہ ہوسکا

کیا دردِ لازوال دیا تیرے عشق نے
میں حادثاتِ غم سے ہراساں نہ ہوسکا

تیری عنایتوں کا نہیں تھا کوئی شمار
مجھ سے علاجِ تنگیِ داماں نہ ہوسکا

اتنے حسیں تھے کاکلِ غم ہائے روزگار
بسملؔ اسیرِ گیسوئے جاناں نہ ہوسکا

O

پھر حسرتوں کے دیپ جلایا کروں گا میں
ظلمت سرائے دل میں اُجالا کروں گا میں

ساقی نہ کر تکلفِ بے جا نظر اُٹھا
پیمانہ توڑ کر تجھے دیکھا کروں گا میں

غم ہائے روزگار نے مجبور کردیا

اب تیری انجمن میں نہ آیا کروں گا میں

دل نے بہت کیا مجھے رسوا گلی گلی
دل کو بہت گلی گلی رسوا کروں گا میں

اک بار پھر نقاب اُلٹ دیجیے ذرا
وعدہ ہوا کہ پھر نہ تقاضا کروں گا میں

اچھا نہ ہوسکا دلِ بسملؔ تو کیا ہوا
اک بار پھر تلاشِ مسیحا کروں گا میں

O

تشنہ لب کب سے پڑا ہوں ترے مے خانے میں
ساقیا ڈال چھلکتی ہوئی پیمانے میں

تا بہ کے تند ہواؤں کے تھپیڑے کھاؤں
جانے کس وقت بہار آئے گی ویرانے میں

لاتعلق ہوئے ایسے کہ شناسا ہی نہ تھے
زندگی ہم نے گنوائی جنھیں اپنانے میں

یا قفس میرا گلستاں سے اُٹھائے صیاد
یا ابھی آگ لگا دے مرے کاشانے میں

گر نہیں مے تو پلا دو سمِ قاتل یارو!
ہاں ذرا ہوش ہے باقی ابھی دیوانے میں

موت بن کر مجھے حالات نے مارا بسملؔ
یوں تو انکار نہ تھا مجھ کو جیے جانے میں

○

تری ہر صبح ہے صبحِ درخشاں
مری ہر شام ہے شامِ غریباں

کوئی منصور پھر سولی پہ لٹکا
بپا ہے شہر میں جشنِ چراغاں

جنھیں سمجھا تھا میں غم خوار اپنا
ملے اکثر بہ اندازِ رقیباں

یزیدِ عصر حاضر سے یہ کہہ دو
نہ سمجھے رائیگاں خونِ شہیداں

نچھاور تجھ پہ ہوں گل ہائے رنگیں
مقدر ہے مرا خارِ مغیلاں

○

تیرے لبوں کو چوم لیا ہے
میں نے کتنا ظلم کیا ہے

تم پر ہی موقوف نہیں کچھ
کس نے کس کا ساتھ دیا ہے

یہ بھی تو جلتا ہے ہمہ شب
دل بھی گویا ایک دِیا ہے

آؤ اور پھر ہاتھ دکھاؤ
میں نے دل کا چاک سیا ہے

بسملؔ کا تم حال نہ پوچھو
آج کی شب مر مر کے جیا ہے

○

تمھارے بعد سکون وقرار کی باتیں
خزاں میں جیسے ہوں فصلِ بہار کی باتیں

ملا نہ کوئی جہاں میں انیس ومونسِ غم
کسے سنائیں دلِ داغدار کی باتیں

تمھاری ذات سے کیونکر جدا ہو ذاتِ رقیب
گلوں کے باب میں آتی ہیں خار کی باتیں

غضب نہیں ہے تو کیا ہے کہ بزمِ عالم میں
فروغ پر ہیں غمِ روزگار کی باتیں

ڈبو کے نوکِ قلم خونِ دل کی سرخی میں
لکھی ہیں ہم نے کلی کے نکھار کی باتیں

ملا تھا بسملؔ ناشاد آج محفل میں
سنا رہا تھا شبِ انتظار کی باتیں

○

تجھ سے الجھ کے سر بہ گریباں ہوں کیا کروں
اپنے کیے پہ خود ہی پشیماں ہوں کیا کروں

تُو نے تو کر دیا ہے ادا حقِ دوستی

صیاد میں ہی ننگِ گلستاں ہوں کیا کروں

کچھ حسرتیں ہیں نقش و نگارِ حریمِ دل
اس قصرِ خستہ حال کا درباں ہوں کیا کروں

میں کب ہوا ہوں پاکیِ داماں کا مدعی
سرکار! میں تو سوختہ ساماں ہوں کیا کروں

ہنستے ہو میرے حال پر اغیار کی طرح
اس طرزِ التفات پہ حیراں ہوں کیا کروں

○

جنھیں اپنے اثاثوں کی پڑی ہے
انھیں کہہ دو قضا سر پہ کھڑی ہے

اُفق سے سرخ آندھی اُٹھ رہی ہے

شبِ پُر ہول منہ کھولے کھڑی ہے

بڑے خطرے میں ہے ناموسِ گلشن
کہ اک مشاق سے بازی اڑی ہے

چمن کی خیر مانگو مل کے سارے
کہ آنے کو قیامت کی گھڑی ہے

یہ نکتہ جان لیں اہلِ گلستاں
سزا جرمِ ضعیفی کی کڑی ہے

O

جہاں کا رنگِ دگر ہے نہ جانے کیا ہوگا
ہر ایک خاک بسر ہے نہ جانے کیا ہوگا

ہنوز شب کی سیاہی ہے دام پھیلائے
یہ اہتمامِ سحر ہے نہ جانے کیا ہوگا

ازل سے تا بہ ابد سیکڑوں مراحل ہیں
بڑا طویل سفر ہے نہ جانے کیا ہوگا

لبوں پہ بول سہانے، دلوں میں بغض وعناد
عجیب حالِ بشر ہے نہ جانے کیا ہوگا

جھُلس گیا ہے چمن آتشیں ہواؤں سے
کہاں نسیمِ سحر ہے نہ جانے کیا ہوگا

میں چھپ کے جس سے ہمیشہ گناہ کرتا رہا
اُسے تو ساری خبر ہے نہ جانے کیا ہوگا

خدا سمجھنا کسی آدمی کو اے بسملؔ
فتورِ قلب و نظر ہے نہ جانے کیا ہوگا

O

جہاں میں ہر کوئی مجھ پر یہی الزام دھرتا ہے
سرِ محفل یہ اک پردہ نشیں کا ذکر کرتا ہے

سفینے ڈوب جاتے ہیں کبھی ساحل تلک آ کر
کبھی بپھری ہوئی موجوں سے بھی ساحل اُبھرتا ہے

گریباں چاک جب دیکھا مرا تو ہنس کے فرمایا
کوئی دیوانگی میں اس طرح حد سے گزرتا ہے!

مریضِ عشق ہیں دونوں مرا ناصح بھی اور میں بھی
میں حالِ دل سناتا ہوں وہ رسوائی سے ڈرتا ہے

ذرا تُو دیکھ تو آ کر یہ کیا حالت ہے بسملؔ کی
بنی ہے جان پر اُس کی نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے

○

چھوڑ گئے اب سکھ کے ساتھی دور ہوئی منزل
تجھ سے پیار کا ناطہ جوڑا بنی ہے کیا مشکل

آگے بڑھنا کام کٹھن ہے پیچھے مڑا نہ جائے

بیچ بھنور میں آن پھنسا ہوں چھوٹ گیا ساحل

تجھ سے پریت نبھاؤں کیسے پاؤں پڑی زنجیر
جینا تو دشوار تھا پہلے مرنا اب مشکل

تو ہے روپ نگر کی رانی میں گلیوں کی دھول
دھول سے روپ نہ بگڑے تیرا اوڑھ ہی لے آنچل

رام کہانی لکھ کر اپنی ہر محفل میں جائے
شعر تو کہنا سیکھ نہ پایا کہلائے بسملؔ

○

حقائق سے جو منہ موڑے ہوئے ہیں
وہ رشتہ موت سے جوڑے ہوئے ہیں

جنھیں غیروں سے اُمیدِ وفا ہے

وہ سیدھا راستہ چھوڑے ہوئے ہیں

اُنھیں ربطِ نہاں صیاد سے ہے
وہ ناطہ ہم سے اب توڑے ہوئے ہیں

خلاؤں میں وہ پھٹ جائیں گے آخر
غبارے تم نے جو چھوڑے ہوئے ہیں

○

حالِ دل کہنے سے ہیں معذور ہم
پاس رہ کر بھی ہیں اُن سے دور ہم

اُن سے نسبت ہے ہماری اس قدر
روزِ روشن وہ، شبِ دیجور ہم

ناز تھا دل کو متاعِ زُہد پر
جس کے لُٹ جانے پہ ہیں مسرور ہم

شہر بھی اپنا دیارِ غیر ہے
ہیں کچھ ایسے بے بس و مجبور ہم

کھُل گیا ہے پارسائی کا بھرم
لاکھ پردوں میں رہیں مستور ہم

برق تھی پنہاں کسی کی آنکھ میں
جل اُٹھے بسملؔ مثالِ طور ہم

○

دشت کو صحرا کو رشکِ گلستاں کہنے لگے
دشمنِ سرو و سمن کو باغباں کہنے لگے

وائے قسمت! موسمِ گل میں لٹا اپنا چمن
ہائے مجبوری! قفس کو آشیاں کہنے لگے

کر دیا تاراج جس نامہرباں نے شہرِ دل
رفتہ رفتہ ہم اُسی کو مہرباں کہنے لگے

حق پرستوں کے لیے جینا جہاں، دشوار ہے
ایسے غم خانے کو اب دارالاماں کہنے لگے

رحم کے قابل ہیں وہ مے خوار، پیرِ میکدہ!
جو سمِ قاتل کو جامِ ارغواں کہنے لگے

○

داغِ غمِ فرقت کو چھپایا نہیں جاتا
اس آگ کو سینے سے لگایا نہیں جاتا

جاتا ہوں بصد شوق درِ یار پہ لیکن
حالِ دلِ بے تاب سنایا نہیں جاتا

ٹھانی ہے کہ اب ہدیۂ جاں پیش کروں گا
یہ بارِ گراں مجھ سے اٹھایا نہیں جاتا

اُتری تھی کبھی جو مرے ویرانۂ دل میں
اُس چاند سی صورت کو بھلایا نہیں جاتا

کیوں آئے ہو بسملؔ کے سرہانے دمِ آخر
بجھتی ہوئی شمع کو جلایا نہیں جاتا

○

زندگی کیا ہے کبھی جو ذہن میں لاتا ہوں میں

اک گھنے جنگل میں جیسے خود کو گم پاتا ہوں میں

تجھ سے پیمانِ وفا بھی توڑ کر دیکھا ندیم
وہ گھڑی جب یاد آتی ہے تو پچھتاتا ہوں میں

ہائے کیا دن تھے کہ یہ دل کا نگر آباد تھا
اب تو اس کی خانہ ویرانی سے گھبراتا ہوں میں

چند سکوں کے عوض بکتی ہے یاں انسانیت
دیکھتا ہوں جب یہ عالم تو لرز جاتا ہوں میں

یاد آتے ہیں وہ اربابِ وفا، اہلِ جنوں
آج کم ظرفوں کو جب مسند نشیں پاتا ہوں میں

میرے چہرے کی سیاہ رنگت کو مت الزام دو
جانے کتنے بدنما چہروں کو چمکاتا ہوں میں

صبح ہوتے ہی بڑھا سڑکوں پہ لوگوں کا ہجوم
چھوڑ کر بچوں کو سوتا کام پر جاتا ہوں میں

کل جن کا امتیاز رہی ہیں حماقتیں
منسوب اُن سے آج ہیں کیا کیا کرامتیں

دینے لگے ہیں درسِ محبت وہ ان دنوں
پنہاں ہیں جن کے اپنے دلوں میں عداوتیں

یہ بے حسی کا دور، قیامت سے کم نہیں
ٹوٹی ہیں بات بات پہ اب یاں رفاقتیں

مقتل سجائے جاتے ہیں عشاق کے لیے
مصلوب ہو رہی ہیں ابھی تک محبتیں

رہتا ہے اضطراب میں دل کس لیے مدام
لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے وہ چاند صورتیں

بستی اجڑ نہ جائے کہیں ڈر یہی تو ہے
گھر پھونک ڈالتی ہیں پرانی رفاقتیں

سننا کسی کی بات گوارا نہیں انھیں

ورنہ ہمیں بھی اُن سے ہیں بسملؔ شکایتیں

○

کرتا ہے آج پھر وہ شبِ غم کا تذکرہ
کل جس نے خود چراغِ محبت بجھا دیا

ہوتا ہے آج قیدِ قفس پر ملول وہ
آزادیوں کا کل جو گلہ گھونٹتا رہا

ہے منتظر بہار کا پھر آج دیکھیے!
کل جس نے فصلِ گل میں گلستاں جلا دیا

مدھم سی ہے پہ ایک کرن ضوفشاں تو ہے
کل تک تو گلستاں میں اندھیروں کا راج تھا

دشمن سے میں شکست نہ کھاتا کبھی مگر
میرا حبیب لشکرِ اعدا سے جا ملا

کلی میں رنگ گلوں پر نکھار تجھ سے ہے
تو ہے بہار سراپا بہار تجھ سے ہے

ترے بدن کی مہک ہے صبا کے دامن میں
ہر عندلیبِ چمن نغمہ بار تجھ سے ہے

تری نگاہِ فسوں ساز کا اثر ہے یہ
مرے کلام میں رنگِ بہار تجھ سے ہے

ہر ایک شام میں شامل ہے تیری رعنائی
ہر ایک صبح مری تابدار تجھ سے ہے

ہے میری ذات پہ الزامِ مے کشی ناحق
مری نظر میں سرور وخمار تجھ سے ہے

مرے وجود سے قائم جہانِ عجز ونیاز
دیارِ حسن میں عزو وقار تجھ سے ہے

یہ سرفروشی کا عالم، یہ عزمِ منصوری

مرا یہ جذبۂ بے اختیار تجھ سے ہے

○

کیف میں ڈوبی شام کی باتیں
ہائے اُس گلفام کی باتیں

ساقی، صہبا جام کی باتیں
سن کر جانا کام کی باتیں

تیرے صدقے اے غمِ جاناں!
بھول گئیں آرام کی باتیں

اس دنیا میں جینا ہے تو
سیکھو درہم دام کی باتیں

خوب ہوا آغازِ محبت
مت پوچھو انجام کی باتیں

بسملؔ کا کیوں نام لیا ہے
چھوڑو! اُس بدنام کی باتیں

○

کیا بھروسہ ہے تیری رحمت کا
وقت کٹتا نہیں مصیبت کا

کون آیا تھا سُوئے گورستاں

سنگ لرزے ہے میری تربت کا

چھا گئی ہے بلا کی تاریکی
بجھ گیا ہے چراغ اُلفت کا

ہو گئے ہیں جہاں میں ہم رسوا
خوب پایا صلہ محبت کا

ہو مبارک تجھے دلِ بسملؔ
وہ بھی قائل ہے تیری عظمت کا

○

کیسی یہ بہارِ زندگی ہے
پژمردہ چمن میں ہر کلی ہے

ہر پھول یہاں خمیدہ سر ہے
ہر شاخ یہاں جھکی جھکی ہے

اُٹھتا ہوا درد کا دھواں ہے
بڑھتی ہوئی غم کی تیرگی ہے

بیٹھا بھی ہوں صحنِ میکدہ میں
پھر بھی وہی دل کی بے کلی ہے

دیکھو تو ہے ایک پھول دنیا
سمجھو تو کھٹکتا خار بھی ہے

بسملؔ سے اب اور کچھ نہ کہنا
بے چارے کی جان پر بنی
ہے

○

کہتا ہے کہ حق بات کا اظہار کرے گا
یہ دل مجھے رسوا سرِ بازار کرے گا

تسلیم مجھے اُس کی ہر اک بات ہے لیکن
وہ میری ہر اک بات سے انکار کرے گا

جینا شبِ تاریک میں آساں تو نہیں ہے
کچھ اس کا مداوا دلِ بیمار کرے گا

اظہارِ حقیقت نہ ہوا آپ سے واعظ
یہ کام تو ہم سا کوئی مے خوار کرے گا

انجام الم ناک مرا دیکھ کے پیارے
ہے کون جو پھر آپ سے یوں پیار کرے گا

اک مردِ خدا مثلِ خلیلؑ آئے گا بسملؔ
نمرود کی آتش کو جو گلزار کرے گا

○

گلستاں کا نکھار تھے کچھ لوگ
کیسے باغ و بہار تھے کچھ لوگ

آج پھرتے ہیں دربدر لیکن
کل دلوں کا قرار تھے کچھ لوگ

اب تہی دست ہو گئے ورنہ
میکدے کا وقار تھے کچھ لوگ

کر گئے جان، آن پر قرباں
ہائے کیا جاں نثار تھے کچھ لوگ

کر گئے آپ اپنا کام تمام
زندگانی پہ بار تھے کچھ لوگ

آج بسملؔ خزاں گزیدہ ہیں
کل سراپا بہار تھے کچھ لوگ

○

لُٹ ہی گیا دل لٹتے لٹتے
گھُٹ ہی گیا دم گھٹتے گھٹتے

کب تک اڑتا آس کا پنچھی

ٹوٹ گئے پر اُڑتے اُڑتے

ہجر کی شب اشکوں کا طوفاں
رک جائے گا رکتے رکتے

تیرے در پر لاکھوں کے سر
جھک جاتے ہیں جھکتے جھکتے

ہجر کی شب اور بسملؔ کا دل
بجھ ہی گیا ہے بجھتے بجھتے

○

میں نے بربادئ گلشن کو نہ دیکھا ہوتا
موت سے پہلے ہی مر جاتا تو اچھا ہوتا

مجھ سیہ بخت کو خوش بخت سمجھنے والو!
کاش تم نے مرے دل میں کبھی جھانکا ہوتا

زخم لگتے نہ کبھی داغ نہ ہوتے دل پر
ایک پتھر سے جو دل کو نہ لگایا ہوتا

کتنے معصوم سے لہجے میں کہا اُس نے مجھے
شبِ فرقت کا بھی احوال سنایا ہوتا

پھر گوارا تھے مجھے سارے زمانے کے ستم
تُو نے اک بار اگر پیار سے دیکھا ہوتا

دیکھ پاتا شبِ ہجراں میں جو بسملؔ کی تڑپ
جانے کیا حال پھر اُس قاتلِ جاں کا ہوتا

○

نظر ملا کے اُسے وقفِ اضطراب کیا
مریضِ غم پہ کرم تُو نے بے حساب کیا

جلا کے اُس نے مجھے خاک میں ملا ڈالا

وہ ایک ذرہ جسے میں نے آفتاب کیا

ستم گروں سے شکایت نہیں گلہ یہ ہے
ہجومِ درد میں تُو نے بھی اجتناب کیا

زمانہ سارا ترے در پہ سجدہ ریز ہوا
مری نگاہ نے جب تجھ کو انتخاب کیا

کچھ اس میں تیری رضائیں بھی کارفرما ہیں
بظاہر اپنی خطا نے مجھے خراب کیا

ہوئے منسوب جو مجھ سے وہ افسانے ہی اچھے ہیں
مجھے اجڑے ہوئے بسملؔ صنم خانے ہی اچھے ہیں

سرِ بازار جو بے ساختہ حق بات کہتے ہیں

فقیہِ حیلہ جُو سے ہم سے دیوانے ہی اچھے ہیں

یہ عادی ہو گئی ہیں آدمی کا خون پینے کی
اب ان آباد سڑکوں سے تو ویرانے ہی اچھے ہیں

سکونِ قلب کی دولت اگر حاصل ہو انساں کو
تو پھر جیسے بھی ہوں اپنے یہ کاشانے ہی اچھے ہیں

بھلی ہوتی ہے یوں تو ہر نئی شے اس زمانے میں
مگر احباب بسملؔ جانے پہچانے ہی اچھے ہیں

○

ہر نئی صورت تری صورت لگے
اوج پر ہے اب مری قسمت لگے

حبس ایسا ہے کہ دم گھٹنے لگا

روح فرسا آج یہ حالت لگے

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں!
دردِ اُلفت میں بڑی شدت لگے

دست و بازو ہیں مرے، بچے مرے
اپنی بے پایاں مجھے طاقت لگے

مرکزِ تبلیغِ اُلفت تھا پہ آج
مدرسہ، سرچشمۂ نفرت لگے

○

ہزار بار تمھیں اپنے گھر بلائیں گے

کہ بار بار سمِ انتظار کھائیں گے

تمھارے نام پہ کیا کیا فریب کھائے ہیں
تمھارے نام پہ کیا کیا فریب کھائیں گے

تمھارے عشق میں کیا کیا ستم اٹھائے ہیں
تمھارے عشق میں کیا کیا ستم اٹھائیں گے

ازل سے جن کا مقدر ہوئی ہے گمراہی
نشانِ منزلِ مقصد کہاں سے پائیں گے

نظر کے سامنے ہے آئنہ گناہوں کا
حساب ہوگا تو کیا اُن کو منہ دکھائیں گے

ہم اہلِ دل ہیں محبت شعار ہے اپنا
محبتوں کی نئی بستیاں بسائیں گے

حریف اپنا عمر سعد ہو کہ ابنِ زیاد
کسی یزید کے آگے نہ سر جھکائیں گے

ہمیں ہیں واقفِ آدابِ کربلا بسملؔ
ہم اپنے خون سے پھر انجمن سجائیں گے

○

ہر ایک شخص یہاں محوِ خود نمائی ہے
کہ ہر کسی کو ہوا زعمِ کبریائی ہے

کوئی بھی اپنے گناہوں پہ شرمسار نہیں
ہر ایک سمت بپا شورِ پارسائی ہے

مجھے عدو کی عداوت سے کوئی خوف نہیں
کہ میں نے اپنے ہی یاروں سے مات کھائی ہے

خزاں نصیب فقط اک مرا ہی مسکن ہے
تمام شہر پہ یوں تو بہار چھائی ہے

حضور! اب تو مرے پاس کچھ نہیں باقی
حضور! اب تو مجھے اذنِ لب کشائی ہے

وفاشناس اگر وہ نہیں تو کیا کہیے
جہاں میں آج کسے پاسِ آشنائی ہے

دیارِ سیم تناں، شہرِ دلبراں گجرات
کبھی کبھی تو بہت اُس کی یاد آئی ہے

کمالِ صدق و یقیں ہے کہ حق شناسوں کی
حیات نوکِ سناں پر بھی مسکرائی ہے

زمانہ لاکھ اُسے بے وفا کہے بسملؔ

مجھے تو اُس کی طبیعت پسند آئی ہے

○

رُخِ روشن سے یوں اُٹھا نقاب آہستہ آہستہ
گھٹا سے جیسے جھانکے ماہتاب آہستہ آہستہ

ادائیں دلبرانہ ہیں نگاہیں قاتلانہ ہیں

قیامت بن گیا اُن کا شباب آہستہ آہستہ

تمھارے حسن میں کیا سحر ہے اے جانِ مے
خانہ!
نگاہیں خود ہی دے دیں گی جواب آہستہ
آہستہ

کہا اُس نے مری بربادیوں کی داستاں سن کر
سنبھل جائے گا یہ خانہ خراب آہستہ آہستہ

ہوا چاہے ہے بسملؔ راہیِ ملکِ عدم شاید
کیا چارہ گروں نے اجتناب آہستہ آہستہ

○

چمک رہا ہے لہو کا نشان کاغذ پر
نکھر گئی ہے میری داستان کاغذ پر

بکھر چکا سرِ بازار جسم و جاں کب سے

ملے گا اب تجھے میرا نشان کاغذ پر

اُٹھائے پھرتا ہوں ہاتھوں پہ آشیاں اپنا
سجائے رکھتا ہوں میں گلستان کاغذ پر

اسی لیے تو کڑی دھوپ سر پہ سہتا رہا
دکھائی دیتا تھا اک سائبان کاغذ پر

جلا کے آگ میں ہاتھوں سے اپنے گلشن کو
تلاش کرتا ہے کیا باغبان کاغذ پر

بہے گی ناؤ یہ کاغذ کی کب تلک تیری
گرائے گا تجھے اب آسمان کاغذ پر

○

گلہ رہا نہ زمانے کی سرد مہری کا
ملا جو اب کے تو کچھ وہ بھی اجنبی سا لگا

جو بوالہوس ہے وہی لائقِ ستائش ہے
نہ جانے اہلِ محبت کا حشر کیا ہوگا

سرشتِ حضرتِ انساں پہ عقل حیراں ہے
خدا نہیں یہ خدائی کا مدعی نکلا

یہ اور بات کہ تُو نے بھلا دیا مجھ کو
ترا خیال بہرحال میرے ساتھ رہا

○

درد سے ناآشنا کوئی یہاں ملتا نہیں

آدمی کو چین زیرِ آسماں ملتا نہیں

مدعی تھا جو خدائی کا جہاں میں کل تلک
آج اُس کو ڈھونڈنے سے بھی نشاں ملتا نہیں

اب کہاں وہ بزم آرائی، وہ یاروں کا ہجوم
گاؤں میں اب اُن بہاروں کا نشاں ملتا نہیں

ہم کہیں بسملؔ جسے گہوارۂ امن وسکوں
وہ زمیں ملتی نہیں وہ آسماں ملتا نہیں

وہ ایک شخص ملا تھا جو ایک بار مجھے
تمام عمر رہا اس کا انتظار مجھے

ستا رہی ہے تری یاد بار بار مجھے
بس ایک بار خدا کے لیے پکار مجھے

لٹا کے میرا نشیمن خزاں کے ہاتھوں سے
صدائیں دیتی ہے رہ رہ کے اب بہار مجھے

اُسی کی یاد میں عمرِ عزیز بیت چلی
گیا تھا چھوڑ کے بسملؔ جو اشک بار مجھے

○

بھیس بدل کر پھر آئے ہیں آفت کے پرکالے لوگ
اپنی جان بچائیں کیسے ،ہم ہیں بھولے بھالے لوگ

ان کا رنگ انوکھا دیکھا اُن کے ڈھنگ نرالے ہیں
یہ محلوں میں رہنے والے کُٹیاؤں کے پالے لوگ

سندر من والوں کو اکثر چاک گریباں دیکھا ہے
اُجلے اُجلے ملبوسوں میں دیکھے من کے کالے لوگ

ڈالی ڈالی سوکھ گئی ہے پتہ پتہ ٹوٹا ہے
جانے وہ کس دیس سدھارے پھولوں کے رکھوالے لوگ

آتی ہے یاد اُن کی رفاقت کبھی کبھی
اُٹھتا ہے دل میں دردِ محبت کبھی کبھی

جلتا رہا ہوں آتشِ فرقت میں ایک عمر
آتا ہے لب پہ حرفِ شکایت کبھی کبھی

کھینچا گیا ہے جب کوئی منصور دار پر
گزری ہے یوں بھی ہم پہ قیامت کبھی کبھی

دیکھا کیے وہ مجھ کو سرِ شامِ میکدہ
ہوتی رہی ہے یہ بھی عنایت کبھی کبھی

○

سکون و راحتِ ہستی سے بیگانہ بنا ڈالا
کسی کی اک نظر نے مجھ کو دیوانہ بنا ڈالا

مجھے بھی اُن کی چاہت ہے کسے چاہت نہیں ہوتی
ذرا سی بات کا دنیا نے افسانہ بنا ڈالا

بڑا احساں کیا ہے مجھ پہ چشمِ مستِ ساقی نے
اسیرِ درد کو پابندِ مے خانہ بنا ڈالا

سراپا کیف و مستی بن کے جب بالائے بام آئے
فقیرِ رہگذر بسملؔ کو مستانہ بنا ڈالا

○

وہ دل میں ہے نہ ہے میرے جگر میں
جو رنگینی ملی تیری نظر میں

سکونِ دل میں وہ ہرگز نہیں ہے
نہاں جو لطف ہے خوف و خطر میں

نگاہوں سے جو اوجھل ہیں ہماری
انھی کا نور ہے شمس و قمر میں

ہمارے دل میں جب موجود ہے تُو
عبث ڈھونڈا ہے تجھ کو بحر و بر میں

سکوں حاصل ہے جو منزل پہ بسملؔ
کسے دیکھا تھا ہم نے رہگذر میں؟

○

حق بات کی تو اتنا گنہگار ہو گیا
ہر شخص میرے قتل پہ تیار ہو گیا

نیرنگیِ زمانہ تو کیجئے ملاحظہ
کانٹا چمن کا زینتِ گلزار ہو گیا

مظلومیت کا اپنی صلہ مل گیا مجھے
وہ دیکھتے ہی مجھ کو، شرمسار ہو گیا

سڑکیں اداس، بند دریچے، خموش لوگ
ویران میرے شہر کا بازار ہوگیا

انصاف مل سکا نہ درِ شہرِ یار سے
اُس شعلہ رُو کا وہ بھی پرستار ہو گیا

○

اک مہرباں کی جب سے نگاہیں بدل گئیں
خوشیاں تمام درد کے سانچے میں ڈھل گئیں

محرومیوں کے بل پہ جیے جا رہے تھے ہم
محرومیاں بھی ہاتھ سے اپنے نکل گئیں

پلنے لگی ہیں قلب و نظر میں کدورتیں
یارو خلوص و مہر کی رسمیں بدل گئیں

صیاد نے تو آگ لگائی تھی میرے گھر
سب کونپلیں چمن کی مرے ساتھ جل گئیں

○

مکینوں سے مکاں خالی پڑے ہیں
یہ کس بستی میں یارو ہم کھڑے ہیں

بہت چھوٹا انھیں اندر سے پایا
بظاہر جو نظر آتے بڑے ہیں

تمھارے حسن کے چرچے سنے تھے
تمھاری راہ میں کب سے پڑے ہیں

وہی ٹھہرے ہیں محرومِ عنایت
تمھارے دشمنوں سے جو لڑے ہیں

شجر اک آج تک زخمی کھڑا ہے
جو باقی تھے وہ پتے اب جھڑے ہیں

نہ جانے کتنا پانی بہہ چکا ہے
ستوں پُل کے مگر اب تک کھڑے ہیں

جو اوجِ دار تک پہنچے ہیں بسملؔ
وہی حق بات کی خاطر لڑے ہیں

○

تہذیب کے اصنام سے ڈر لگتا ہے
ناموس کے نیلام سے ڈر لگتا ہے
انسان کی یہ عیش پرستی توبہ
اس دور کے انجام سے ڈر لگتا ہے

○

آج پھر اُن کی نظرِ کرم ہوگئی
تلخیِ زندگی کچھ تو کم ہو گئی

توبہ توبہ پرستش کا عالم ہے کیا
کیوں جبیں اُن کے قدموں پہ خم ہوگئی

دشمنِ حرمتِ آدمی، آدمی
دوستو! انتہائے ستم ہو گئی

جب بھی چھونے لگا سنگِ منزل کو میں
آگے منزل مری دو قدم ہو گئی

اک نظر سُوئے بسملؔ ابھی اور ہو
اک قیامت تمھاری قسم ہو گئی

○

ایسا کانٹا چُبھا ہے پاؤں میں
چلنا مشکل ہوا ہے گاؤں میں

کاٹ لو گے جو سایہ دار شجر
کیسے بیٹھو گے ٹھنڈی چھاؤں میں

کوئی آندھی پھر آنے والی ہے
شور کتنا ہے پھر ہواؤں میں

آگ گلشن میں ہو لگی جیسے
اُڑ رہا ہے دھواں فضاؤں میں

زہر الفاظ سے ٹپکنے لگا
تیر چلنے لگے صداؤں میں

مال کیا کیا بٹا غنیمت کا
اونچی اونچی محل سراؤں میں

رہزنوں کا تو خیر ذکر ہی کیا
بات الجھی ہے رہ نماؤں میں

پہلے دھرتی کے روگ ختم کرو

پھر بسیرا کرو خلاؤں میں

پھر دھماکہ کوئی نہ ہوجائے
بڑھ گئی ہے گھٹن فضاؤں میں

سوچتا ہوں کہ زندگی بسملؔ
کیسے گزرے گی کج اداؤں میں

○

اُن کو بٹھا کے اپنے مقابل بیاں کروں
جی چاہتا ہے رازِ محبت عیاں کروں

اے ربِ دو جہاں مری حالت پہ اک نظر
کس در پہ جا کے نالہ وآہ وفغاں کروں

ہر سُو اُٹھی ہیں آندھیاں مکرو فریب کی
آ تجھ کو اپنے خانۂ دل میں نہاں کروں

ذروں میں بھی ظہور ہے تیری ہی ذات کا
مشکل یہ آ پڑی ہے کہ سجدہ کہاں کروں

گزرا یہاں سے قافلہ اربابِ عشق کا
اپنی جبیں کو گردِ رہِ کارواں کروں

O

ہر چہرے پر لکھی ہوئی تحریریں پڑھتا رہتا ہوں
میں اس شہر کے لوگوں کی تقدیریں پڑھتا رہتا ہوں

غم کے زمانے بیت گئے ہیں، خوشیوں کی رُت آئی ہے
روز اخباروں میں ایسی تقریریں پڑھتا رہتا ہوں

کوئی کس انداز میں اس دھرتی کی خاطر سوچتا ہے
ذہنوں میں پنہاں ہیں جو تدبیریں پڑھتا رہتا ہوں

جانتا ہوں ساحل تک آ کر کشتی کیسے ڈوب گئی
اب اُس پر لکھوائی گئی تفسیریں پڑھتا رہتا ہوں

اُن کے نام سے وابستہ اوصاف ہیں سب معلوم مجھے
اپنے نام لکھی ہیں جو تقصیریں پڑھتا رہتا ہوں

جاگتی آنکھوں سے میں بسملؔ دن کو سپنے دیکھتا ہوں
کالی راتوں میں ان کی تعبیریں پڑھتا رہتا ہوں

○

غیر پھرتا ہے اُٹھاتا ہوا طوفاں دیکھو
گر نہ جائے کہیں دیوارِ گلستاں دیکھو

رات آیا کوئی اس گھر میں گلابا[ا] شاید
در و دیوار پہ دہشت ہے نمایاں دیکھو

آج ہر کوچہ و بازار بنا ہے مقتل
ہے ہر اک سمت بپا ماتمِ یاراں دیکھو

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا گھر میں
شہر میں ہوتا ہے ہر رات چراغاں دیکھو

عرصۂ حشر میں پھرتا ہے چھپائے سر کو
میرا قاتل بھی ہے اب کتنا ہراساں دیکھو

موسمِ گل ہو چلیں ٹھنڈی ہوائیں پھر سے
قریہ قریہ ہو مرا رشکِ گلستاں دیکھو

کاش! لوٹ آئے مرا عہدِ جوانی بسملؔ
پھر سرِ شام سجے محفلِ یاراں دیکھو

[ا] ہتھوڑا گروپ کا مبینہ سرغنہ گلاب خان

○

پُر کیف گلستاں کا سماں ہوتا ہے
جلوہ تیرا ہر گل سے عیاں ہوتا ہے
ان آنکھوں نے دیکھا تجھے جب سے واللہ
خود اپنے پہ بھی تیرا گماں ہوتا ہے

قطعات

مجھ رو سیاہ پہ تیری عنایت کی حد نہیں
تیرے کرم کی، تیری فضیلت کی حد نہیں
تسلیم ہے کہ میری خطائیں ہیں بے حساب
اے ربِ دو جہاں تیری رحمت کی حد نہیں

○

خوشا نصیب کہ میں ہوں گدائے ابنِ علیؑ
بسی ہے میری رگوں میں ولائے ابنِ علیؑ
کہو درود وسلام ان پہ اے جہاں والو!
ہے قدسیوں کی زباں پر ثنائے ابنِ علیؑ

○

ارزاں تھا خونِ قوم اُسے بھول جاؤ تم
ایوانِ اقتدار میں خوشیاں مناؤ تم
تقسیمِ ارضِ پاک پہ نالہ بلب ہوں میں
تعمیرِ ملکِ نو کے ترانے سناؤ تم

○

حادثہ ہو نہ جائے کوئی ساقیا
بے سبب جام سے جام ٹکرا گیا
ہو چلا ہے یہ کیا چاندنی رات میں
چاند تاروں کو بھی وجد آنے لگا

○

ہے تعاقب میں فرشتہ موت کا
جانے کب آ جائے منزل دوستو!
ٹوٹ جائے کب فصیلِ جسم و جاں
کب دھڑکنا چھوڑ دے دل دوستو!

○

ایک بھی تو نہ میری مانی ہے
کیا تشدد کی حکمرانی ہے
چارہ گر چھوڑ دے علاج مرا
مَیں نے مرنے کی آج ٹھانی ہے

○

ہمیں مجنون و آوارہ کہو گے ہم نہ کہتے تھے
ہماری بے بسی پر تم ہنسو گے ہم نہ کہتے تھے
ہمیں بھی ایک دن الزام دے کر بے وفائی کا
سرِ محفل رقیبوں سے ملو گے ہم نہ کہتے تھے

○

ہیں گرچہ ہدف دنیا میں آفات کا ہم
کرتے نہیں شکوہ کبھی اس بات کا ہم
کس فکر میں ہے اے غمِ دوراں سن لے
رُخ پھیر کے رکھ دیتے ہیں حالات کا ہم

○

دل ٹوٹ گیا ضبط کا یارا نہ رہا
جینے کا یہاں کوئی سہارا نہ رہا
چھوڑا تھا زمانے کو فقط جس کے لیے
افسوس کہ وہ شخص ہمارا نہ رہا

○

اُجڑا ہوا مے خانہ بسائیں ساقی
روٹھے ہوئے مے خوار منائیں ساقی
تجدیدِ تعلق سے اُٹھا کر قدغن
پھر بزمِ طرب اپنی سجائیں ساقی

○

مرے دل میں اب تو باقی یہی آرزو ہے پیارے
یونہی عمر بیت جائے تری یاد کے سہارے
تھے شریکِ راہ دونوں پہ نصیب اپنا اپنا
میں غریقِ بحرِ غم ہوں تجھے مل گئے کنارے

○

محبت ابتدائے زندگی ہے
محبت انتہائے آدمی ہے
محبت ہے جہاں میں منبعِ نور
محبت سے جہاں میں روشنی ہے

○

مجھے سوزِ محبت سے نوازا
مرا دل ہر گھڑی شعلہ فشاں ہے
میں تنہائی میں اکثر سوچتا ہوں
خدایا! تُو بڑا ہی مہرباں ہے

○

بڑی پُر ہول ہے تاریکیِ شب
ترستی ہے نظر رُوئے سحر کو
مجھے مطلوب ہے بینائی میری
کوئی سمجھائے میرے چارہ گر کو

○

پہلے تو آشیاں مرا برباد کردیا
پھر اپنی قید سے مجھے آزاد کردیا
بے بال و پر ہوں طاقتِ پرواز بھی نہیں
صیاد تُو نے کیا ستم ایجاد کردیا

○

ساقی تری نظر میں مچلتی ہیں مستیاں
سارے جہاں کو رقص کناں پا رہا ہوں میں
ساغر بکف، نشیلی ہواؤں کے دوش پر
محسوس ہورہا ہے اُڑا جارہا ہوں میں

○

تھی وہ جو عمر بھر کی ریاضت کا ماحصل
عزت ہماری آج سرِ بزم کھو گئی
تذلیل دشمنوں کی زباں سے نہ جو ہوئی
وہ دوستوں کے حسنِ تکلم سے ہوگئی

○

عمر پیالہ بھرنا ہے آج نہیں تو کل
سب کو اک دن مرنا ہے، آج نہیں تو کل
تم کو بھی اس بستی کے شہ زور و سن لو!
موت کے گھاٹ اُترنا ہے آج نہیں تو کل

○

بچھڑ گئی ہے جو صورت تلاش کرتا ہوں
میں اپنی کھوئی محبت تلاش کرتا ہوں
ہر آن رنگ بدلتے ہوئے زمانے میں
میں ایک رنگِ شرافت تلاش کرتا ہوں

○

ہر حقدار کو ملنا ہے حق اس کا جو ہے
اُلٹا پہیہ پھرنا ہے آج نہیں تو کل
بستی میں ہر غاصب کے شیش محل نے بھی
بسملؔ دھم سے گرنا ہے آج نہیں تو کل

○

ہر ایک شخص اُسی کی دہائی دیتا تھا
بڑا عجیب سا منظر دکھائی دیتا تھا
محل کے سامنے اک شور تھا قیامت کا
امیرِ شہر کو اونچا سنائی دیتا تھا

○

بزمِ حسنِ جمال میں گزری
عمر تیرے خیال میں گزری
زندگانی کا حال کیا کہیے
زندگانی ملال میں گزری

دو شعر

میکدے میں قیام کرتے ہیں
رند تیری رضا پہ مرتے ہیں
چند کلیوں کا خون ہے اس میں
احترامِ بہار کرتے ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زندگی کے میلے میں

انتسابِ اول

کھٹڑ قبیلے کے عظیم رہنما، پیکرِ شرافت اور سراپا دیانت الحاج سردار محمد صادق

خان (مرحوم) کے جواں ہمت فرزند میجر ریٹائرڈ طاہر صادق خان ضلعی ناظم ضلع اٹک کے نام جو حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے درج ذیل شعر کی مجسم تصویر ہیں:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

انتساب دوم

میرے خاندان کے خوب صورت اور کھٹڑ قبیلے کے ہر دلعزیز نوجوان نثار احمد خان (مرحوم) سابق چیئرمین یونین کونسل اجوالہ تحصیل فتح جنگ کے

ناجن کی جواں مرگی کتاب ہذا کی تخلیق کا باعث بنی۔

تجھ کو چھوڑ کے جانے کی کیا جلدی تھی
روز کہاں دنیا کا میلہ لگتا ہے

سلطان محمود بسمل نظم گو شعراء کی صف میں

بین الاقوامی شاعری میں نظم کو ایک مسلمہ حیثیت حاصل ہے۔نظم کی ہمہ گیری اس لیے بھی مسلمہ ہے کہ وہ اپنے سیاق وسباق کے ساتھ دلوں پر ایک جامع تاثر چھوڑتی ہے۔ بیسویں صدی عیسویں میں نظم گو شاعروں میں جوش ملیح آبادی، احسان دانش،سردار جعفری، ن م راشد، میراجی، اور اختر شیرانی کے نام نمایاں ہیں بلکہ ان میں سے کچھ نام تو نظم کے قلعہ کے ستون ہیں اوران کی حیثیت تسلیم شدہ ہے۔بقول آل احمد سرور نظم میں تفصیل، وضاحت اور صراحت ایک حسن ہے۔نظم گو معمولی جزئیات کو نفاست کے ساتھ قاری تک پہنچاتا ہے اور نظم کی تکمیل میں نظم کی جامعیت پر نظر رکھتا ہے۔

شاعری پر بات کرتے ہوئے ایک مہذب، سنجیدہ پن کی ضرورت ہے اور میں

اسی تہذیبی ادبی رشتے کے اعتبار سے ایک مجموعہ نظم پر بات کی ابتدا کر رہا ہوں۔

سلطان محمود بسمل اٹک شہر کے مشہور و معروف شاعروں میں سے ہیں اور آزاد شاعری کے اس مجموعہ سے پہلے ان کی غزلوں کا مجموعہ ''ساغرِ سم'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نامور ادیب و شعرا نے ان کے کلام کو سراہا ہے جن میں ڈاکٹر سعد اللہ کلیم بھی شامل ہیں۔

اب ان کا مجموعہ نظم ''زندگی کے میلے میں'' میرے سامنے ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک ہی نظم ہے جو روزمرہ زندگی کی مختلف جہتوں سے اپنا اپنا عنوان لیے ہوئے ہے اور یہ طویل نظم زندگی کے ہر رخ کی تصویر کا عکس ہے۔ حسن و عشق، ہجر و وصال، غربت و امارت، تمدن و ثقافت، مزدوری و سرمایہ داری، جھوٹ اور سچائی، بڑوں کا چھوٹا پن اور چھوٹوں کی بڑائی، غرض یہ کہ زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس کا اس نظم میں ذکر نہ ہو۔ سلطان محمود بسمل کی یہ شاعری شعریت کے ساتھ خوب صورت تصویر کشی بھی کرتی ہے۔ اس نظم میں بسمل کا اپنا اسلوب ہے اور وہی اسلوب اس کی شناخت ہے۔ نظم کا لہجہ عوامی ہے۔ سرسری طور پر بھی اگر آپ اس نظم کا مطالعہ کریں تو آپ بھی نظم کی گہرائی اور گیرائی کے معترف ہو کر میرے ہم آواز ہوں گے۔

عوامی شاعری کرنا آسان نہیں۔ یہ بڑی جاں فشانی اور عرق ریزی کا کام ہے۔ اس نظم کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیں:

دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی بے بضاعتی

اس جہانِ فانی میں
ہے مقام حیرت کا
آدمی جو آتا ہے

خالی ہاتھ آتا ہے
زندگی کے میلے میں

دیس کی مٹی سے پیار اور وطن سے بے لوث محبت:

اپنے دیس کی مٹی
سونے اور چاندی سے
دوستو! فزوں تر ہے
جان سے بھی پیاری ہے
زندگی کے میلے میں

میرے دیس کا گبرو
میرا مان ہے بسملؔ
میری شان ہے بسملؔ
میری جان ہے بسملؔ
زندگی کے میلے میں

اس طویل نظم کے مجموعہ میں ماں کی محبت کا تقدس، مذہبی پاکیزگی، سچے رہنماؤں سے پیار، کیا کچھ نہیں ہے۔ نظم کا ہر حصہ ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ذہن کو روشنی اور روح کو تازگی فراہم کرتا ہے۔ سلطان محمود بسملؔ منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی نظموں کا یہ مختصر مجموعہ ادبی دنیا میں ان کی شاعری کی منزلت میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

نصرت زیدی

ہم بسمل کو ان شعرا کی صف میں کھڑا کر سکتے ہیں جو قدیم اور جدید کے ایسے امتزاج کے قائل ہیں جس میں پلڑا ذرا سا قدیم کی جانب جھکا ہوا رہتا ہے۔ ان روایتی خدوخال میں جدید دور کا شعور جہاں جہاں دمکتا ہے، بڑا مزہ دیتا ہے۔

ڈاکٹر سعد اللہ کلیم

سلطان محمود بسمل کی شاعری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور بڑے بڑے دکھوں کو گفتگو کے انداز میں بیان کیا ہے۔اس سے ان کی وسعتِ نظر اور شعور کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

رشید نثار

میلہ

میلہ ہماری تہذیب کی ایک قدیم روایت ہے۔کون ایسا ہے جس نے میلہ نہیں دیکھا۔ چھوٹے بڑے، بچے بوڑھے، سب ان میلوں میں جاتے ہیں اور بڑے شوق سے شریک ہوتے ہیں۔

میلوں میں رنگارنگ دلچسپی کے کھیل تماشے اور سیر وتفریح کے سامان موجود ہوتے ہیں۔لوگ اپنی اپنی پسند کے پروگرام دیکھتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ زندگی کا میلہ بھی اسی طرح کا ایک میلہ ہے مگر اس میں خوشی بھی ہے اور غم بھی۔ اس میں تلخی بھی ہے اور شیرینی بھی۔ میں نے جو کچھ اس میں دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے، اسے مختصر مصرعوں میں قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، وہ سب کچھ اس میں موجود ہے جو زندگی کے میلے، میں ہوتا ہے۔ پھر بھی ''زندگی کے میلے میں'' آپ کو بہت کچھ ملے گا۔

اس کتاب کی طباعت میں جن دوستوں نے میری مدد کی ہے، میں ان کا ممنونِ احسان ہوں۔ محسن عباس ملک اور پروفیسر غلام ربانی فروغ کی نیک خواہشات ہمیشہ میرے شاملِ حال رہی ہیں۔ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔''زندگی کے میلے میں'' آپ بھی میرے ساتھ شامل ہو جائیں اور میلہ دیکھتے جائیں:

ع: آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

سلطان محمود بسمل

زندگی کے میلے میں
کیا بتائیں کیا دیکھا

تیرے نور کا جلوہ
ہم نے جابجا دیکھا

○

زندگی کے میلے میں
آپؐ جس گھڑی آئے

جگمگا اُٹھی محفل
پھول کِھل اُٹھے ہر سُو
پھیلتی گئی خوشبو

○

زندگی کے میلے میں
ارضِ کربلا ہم کو

یہ سبق سکھاتی ہے
حق کے راستے میں جو
اپنا گھر لُٹاتا ہے
اپنا سر کٹاتا ہے
سربلند ہوتا ہے

○

زندگی کے میلے میں
ایک معرکہ دیکھا

کربلا کے صحرا میں
فاطمہؓ کے بیٹے نے
سر کٹا کے سجدے میں
ظلم کی حکومت کو
خاک میں ملا ڈالا

○

زندگی کے میلے میں
چند خوشنما چڑیاں
کھیلنے کو آتی ہیں

خوب چھچھاتی ہیں
اور پھر خموشی سے
بے نشان منزل کو
ڈھونڈنے نکلتی ہیں
پھر کبھی نہیں ملتیں

○

زندگی کے میلے میں
جب نصیب کی دیوی

مہربان ہوتی ہے
اپنی اصل کو بسملؔ
لوگ بھول جاتے ہیں

○

زندگی کے میلے میں
کتنے خوب صورت لوگ

کھیلنے کو آئے تھے
چند ساعتیں کھیلے
پھر نہ جانے چپکے سے
کس جہاں میں جا بیٹھے

O

زندگی کے میلے میں
سب فضول چیزیں ہیں

تیری چند یادیں ہی
میری زندگانی کا
قیمتی اثاثہ ہیں

○

زندگی کے میلے میں

شوق کا تقاضا ہے
رکھ کے سر ہتھیلی پر
سوئے گوہرِ مقصود
آدمی بڑھا جائے

○

زندگی کے میلے میں
ہے مقام عبرت کا

اس جہانِ فانی میں
جو کوئی بھی آتا ہے
خالی ہاتھ جاتا ہے

○

زندگی کے میلے میں
کھیل چار دن کا ہے

چار دن بہاریں ہیں
ایک پھول کی مانند
کھِل کے مسکرائے جا
اور جگمگائے جا

○

زندگی کے میلے میں
پُرسکون جینے کا

ایک ہی طریقہ ہے
آدمی کا دل بسملؔ
خواہشوں سے خالی ہو

○

زندگی کے میلے میں
دھوپ بھی ہے چھاؤں بھی

پھول بھی ہیں کانٹے بھی
رنگ بھی ہیں خوشبو بھی
آس بھی ہے حسرت بھی
رنج بھی ہے رات بھی
پیار بھی ہے نفرت بھی

O

زندگی کے میلے میں
بلدۂ کراچی میں
امن کا یہ عالم ہے

آئے روز سڑکوں پر
بے گناہ لوگوں کے
سر اُڑائے جاتے ہیں
دھڑ گرائے جاتے ہیں
گھر جلائے جاتے ہیں

○

زندگی کے میلے میں

یہ خبر نہ تھی ہم کو
آئنہ دکھانے سے
لوگ روٹھ جاتے ہیں

○

زندگی کے میلے میں

کتنی سرد مہری ہے
بات بات پر اب تو
پگڑیاں اچھلتی ہیں
ٹوٹتے ہیں یارانے

زندگی کے میلے میں
خالقِ حقیقی نے
جو بھی چیز پیدا کی
کتنی خوب صورت ہے

○

زندگی کے میلے میں
موسمِ بہاراں میں

محفلِ نگاراں میں
جو بھی وقت بیتا ہے
کتنا خوب صورت تھا
اس کی یاد میں بسملؔ
دل فگار رہتا ہے
بے قرار رہتا ہے

○

زندگی کے میلے میں

لاکھ دکھ سہی لیکن
وضع دار لوگوں کے
دم قدم سے رونق ہے

زندگی کے میلے میں
آؤ فیصلہ کرلیں
تم ہمیں کہو اپنا
ہم تمھیں کہیں جاناں!

○

زندگی کے میلے میں

ایک روز ایسا بھی
ہر کسی پہ آنا ہے
یہ جہانِ رنگ وبو
سب کو چھوڑ جانا ہے

○

زندگی کے میلے میں

ہم نے دور تک بسملؔ
گھوم پھر کے دیکھا ہے
جو بھی ہو مقدر میں
آدمی کو ملتا ہے

زندگی کے میلے میں
کیا ستم ظریفی ہے
جس کا ظرف عالی
اُس کا جام خالی ہے

زندگی کے میلے میں
ایک رسم ایسی ہے
کوئی دکھ اُٹھاتا ہے
کوئی مسکراتا ہے

○

زندگی کے میلے میں

عید جب بھی آتی ہے
دور جانے والوں کی
یاد ایسے عالم میں
میرا دل جلاتی ہے

○

زندگی کے میلے میں

چاند رات میں اکثر
یاد کر کے میں تجھ کو
بے قرار رہتا ہوں
چپکے چپکے روتا ہوں

○

زندگی کے میلے میں
اک مقام ایسا ہے

جس مقام سے آگے
بے کراں اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
دل کے داغ جلتے ہیں
یہ چراغ جلتے ہیں

○

زندگی کے میلے میں

کھیل یوں بھی دیکھا ہے

کوئی جیت کر بازی

جان ہار جاتا ہے

○

زندگی کے میلے میں

بہہ رہا ہے اک دریا
جس کی تُند موجوں میں
ڈھونڈنے سے ملتی ہے
موتیوں کی اک مالا

زندگی کے میلے میں
بات یہ مسلّم ہے
جو بھی زور آور ہے
اس کا بخت یاور ہے

○

زندگی کے میلے میں

راستہ بدل کر بھی
ہم نے بارہا دیکھا
بے نشان منزل کا
کب نشان ملتا ہے؟

○

زندگی کے میلے میں

اَن گنت جھمیلے میں
کون کس کا ساتھی ہے
کون کس کا اپنا ہے
کل بھی ہم اکیلے تھے
آج بھی اکیلے ہیں

○

زندگی کے میلے میں

اس طرح بھی ہوتا ہے
جب کبھی کوئی ساتھی
راہ سے بھٹک جائے
قافلے سے کٹ جائے
پھر کبھی نہیں ملتا

○

زندگی کے میلے میں

مجھ کو ناز ہے بسملؔ
میں نے اپنی دھرتی سے
ٹوٹ کر محبت کی

○

زندگی کے میلے میں
اپنے دیس کی مٹی
سونے اور چاندی سے
دوستو! فزوں تر ہے

○

زندگی کے میلے میں

میرے دیس کا گبھرو
میری آن ہے بسملؔ
میری شان ہے بسملؔ
میرا مان ہے بسملؔ
میری جان ہے بسملؔ

○

زندگی کے میلے میں

سر جھکائے بیٹھا ہوں
تجھ کو یاد کرتا ہوں
یاد کرکے روتا ہوں

○

زندگی کے میلے میں

ایک لمحہ ایسا بھی
ایک بار آتا ہے
آدمی کو جو بسملؔ
ایک پل ہنساتا ہے
عمر بھر رُلاتا ہے

○

زندگی کے میلے میں

اتنی بھیڑ ہے بسملؔ
اک متاعِ جان و دل
ہائے کھو گئی مجھ سے !
لاکھ ڈھونڈتا ہوں میں
کچھ پتہ نہیں چلتا

O

زندگی کے میلے میں
غاصبوں کا شیوہ ہے
دوسروں کی محنت کا
پھل اُتار لیتے ہیں
کچھ صلہ نہیں دیتے

○

زندگی کے میلے میں
ایک چہرہ ایسا ہے
چاند سے زیادہ جو
ہر گھڑی چمکتا ہے

نور کا جو ہالہ ہے
موتیوں کی مالا ہے
خوشبوؤں کا مخزن ہے
صبح وشام روشن ہے
پُر اثر دعاؤں کا
بے بہا خزانہ ہے
میری ماں کا چہرہ ہے

○

زندگی کے میلے میں
ظلمتوں کا ڈیرہ ہے
ہر طرف اندھیرا ہے

طالبانِ راہِ حق
انتظار کرتے ہیں
نور کے اجالے کا
کب پیام آئے گا؟
کب امام آئے گا؟

○

زندگی کے میلے میں
ہم نے یہ بھی دیکھا ہے

مردِ حق کی ٹھوکر سے
قصرِ شہ کی دیواریں
منہدم ہوئیں پل میں

○

زندگی کے میلے میں

آج کی سیاست میں
کس طرح کی باتیں ہیں
دوستی کے پردے میں
دشمنی کی گھاتیں ہیں

○

زندگی کے میلے میں

کارواں سے جو بچھڑا
میں وہی مسافر ہوں
شل تھکن سے پاؤں میں
زادِ راہ بھی کم ہے
بے بسی کا عالم ہے

○

زندگی کے میلے میں

خود غرض زمانے میں
ہر کسی کی خواہش ہے
سارا شہر جل جائے
اس کا گھر سلامت ہو

○

زندگی کے میلے میں

بے حسی کے طوفاں نے
بستیاں مروت کی
وقت کے سمندر میں
دوستو! ڈبوئی ہیں

○

زندگی کے میلے میں

ایک شخص کے دم سے
شہرِ دل کے سب موسم
کتنے خوب صورت تھے

زندگی کے میلے میں
بے امان دنیا میں
آج ہم جو زندہ ہیں
یہ کرم ہے مولا کا

○

زندگی کے میلے میں
دن کی روشنی ہو یا!

رات کا اندھیرا ہو
اپنے شہر کی گلیاں
خوف کی علامت ہیں
اپنے شہریاروں کو
ہم دعائیں دیتے ہیں

○

زندگی کے میلے میں
اک تمھارے ہونے سے

کس بلا کی رونق تھی
اور اب تمھارے بعد
ہر طرف خموشی ہے
ہر طرف اداسی ہے

○

زندگی کے میلے میں
چند لوگ ایسے بھی

زندگی میں ملتے ہیں
جو بچھڑ بھی جائیں تو
اک طویل مدت تک
ان کی یاد کی خوشبو
حجلۂ تخیل کو
عطر بیز رکھتی ہے

○

زندگی کے میلے میں

شہرِ علم کے در سے
یہ سبق ملا بسملؔ
پُر خطر مراحل میں
شمع زندگانی کی
موت خود محافظ ہے

○

زندگی کے میلے میں

ساتھ چلنے والوں کا
اعتبار کیا کیجیے؟
ساتھ چلنے والوں میں
یار بے یقیں بھی ہیں
مارِ آستیں بھی ہیں

○

زندگی کے میلے میں
سب نے اپنے ہاتھوں سے

اپنا سر چھپانے کو
ایک گھر بنایا تھا
اور اب سبھی مل کر
آپ اپنے ہاتھوں سے
اپنے گھر کی دیواریں
جانے کیوں گراتے ہیں

○

زندگی کے میلے میں

میرے دیس کے باسی
منتظر ہیں برسوں سے
ایک ایسے رہبر کے
جو امین و عادل ہو
صاحبِ صداقت ہو
پیکرِ شرافت ہو

○

زندگی کے میلے میں

اس طرح بھی ہوتا ہے
اک ذرا سی خواہش پر
بھائی اپنے بھائی کا
خون چوس لیتا ہے

○

زندگی کے میلے میں

سیر کیجیے لیکن
احتیاط لازم ہے
اس سرائے فانی میں
جس طرح سے کرنی ہے
اس طرح سے بھرنی ہے

O

زندگی کے میلے میں
ہم نے جب قدم رکھا
اس جہاں میں جینے کے

کچھ اصول قائم تھے
اور اب یہ عالم ہے
زندگی کی راہوں میں
ظلم و غرض کی دیوی
اپنے دام پھیلائے
صبح و شام رقصاں ہے

○

زندگی کے میلے میں
ہم نے کیا نہیں دیکھا

پیار کے سبھی رشتے
درد کے کئی نشتر
وصل کی حسیں گھڑیاں
ہجر کی کئی صدیاں
اور اب یہ خواہش ہے
اور کچھ نہ ہم دیکھیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نوائے دِل

☆ سردار بہادر خان (مرحوم)

☆ والدِ گرامی سردار محمد خان (مرحوم)

☆ والدہ ماجدہ بی بی غلام عائشہ (مرحومہ)

اور

☆ عزیزم سردار نثار احمد خان (مرحوم)

کے

نام

○

مے خانۂ حیات کا کیسا نظام ہے
ہر ایک غم گسار یہاں تشنہ کام ہے

وہ پاس تھا تو کب مجھے سونے کا تھا خیال

اب دُور ہے تو آنکھ کا لگنا حرام ہے

میرے کشیدہ سر کے لیے حکمِ شاہ پر
ہر تیغِ آبدار ہوئی بے نیام ہے

ساتھی بچھڑ رہے ہیں ہر اک موڑ پر یہاں
اب جادۂ حیات کو میرا سلام ہے

اے مادرِ وطن ترے قربان جایئے
ہر ذرّہ تیرا لائقِ صد احترام ہے

○

جیسے جیسے عمر گزاری جاتی ہے
جانے کیوں بے چینی بڑھتی جاتی ہے

دن میں سورج آگ کا سایہ ہوتا ہے

رات کی خنکی جسم جلاتی جاتی ہے

حرفِ صداقت کہنے والا مجرم ہے
اونچے سر سے دار سجائی جاتی ہے

گلی گلی میں پھیل گئی بارود کی بُو
آنگن آنگن آگ لگائی جاتی ہے

قابیل و ہابیل ابھی تک زندہ ہیں
بات وہی اب تک دہرائی جاتی ہے

ڈوبتے سورج کی کرنیں یہ کہتی ہیں
زیست کی روشن شمع بجھائی جاتی ہے

پھولوں کی خوشبو، چڑیوں کی چہکاریں
لان میں دیکھو بزم سجائی جاتی ہے

منگلا کے رنگین نظارے ڈستے ہیں
یاد کسی کی خون رُلاتی جاتی ہے

بچھڑے ہوئے دل آپس میں جب ملتے ہیں
برلن کی دیوار گرائی جاتی ہے

بسملؔ صبح سہانی آنے والی ہے
غم کی کالی رات گزرتی جاتی ہے

○

تیری اک نگاہ پہ وارنے دلِ بے قرار چلے گئے
جنھیں پیار تھا ترے نام سے سوئے اوجِ دار چلے گئے

نہ گلے ہیں اب نہ شکایتیں، نہ ترے ستم کی حکایتیں
تری بزمِ ناز کو چھوڑ کر ترے دل فگار چلے گئے

نہ وہ ولولے نہ وہ حوصلے، نہ وہ انتظار کے سلسلے
انھیں اب نہ ڈھونڈ روش روش ترے جانثار چلے گئے

نہ وفا رہی ،نہ جفا رہی، نہ اناالحق کی صدا رہی
"جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے"[۱]

وہی شہر ہے ،وہی رہگزر ،وہی لوگ ہیں ،وہی بام ودر
جنھیں ڈھونڈتی ہے مری نظر وہ اُفق کے پار چلے گئے

وہ جو عہد تھا اسے توڑ کر، مجھے قتل گاہ میں چھوڑ کر
مجھے دے کے جھوٹی تسلیاں مرے غم گسار چلے گئے

[۱]مصرعۂ فیض

○

تیری ہر صبح ہے صبحِ درخشاں
مری ہرشام ہے شامِ غریباں

کوئی منصور پھر سولی پہ لٹکا

بپا ہے شہر میں جشنِ چراغاں

جنھیں سمجھا تھا میں غم خوار اپنا
ملے اکثر بہ اندازِ رقیباں

یزیدِ عصر حاضر سے یہ کہہ دو
نہ سمجھے رائیگاں خونِ شہیداں

نچھاور تجھ پہ ہوں گل ہائے رنگیں
مقدر ہے مرا خارِ مغیلاں

○

کھلی جو آنکھ دیکھا بندہ پنجرہ
کبھی دیکھا نہ ایسا بند پنجرہ

کوئی کھڑکی ہے اس میں اور نہ روزن

جہنم کا ہے نقشہ بند پنجرہ

گھٹا جاتا ہے دم ایسی گھٹن ہے
نہ جانے کب کھلے گا بند پنجرہ

نکلتا تو کبھی شیشے کے گھر سے
تجھے بھی میں دکھاتا بندپنجرہ

نہ راس آئیں مجھے تازہ ہوائیں
مقدر میں لکھا تھا بند پنجرہ

کھلے گھر کے لیے مانگیں دعائیں
نصیبوں نے دکھایا بند پنجرہ

گزرتی جائے ہے یہ زندگانی
کبھی اے کاش! کھلتا بند پنجرہ

پتہ صیاد سے پوچھا جو میرا
اشارے سے دکھایا بند پنجرہ

بھلا کر عہدِ تعمیرِ نشیمن
ستم گر نے بنایا بند پنجرہ

جہاں میں اِن دنوں تنہا ہوں بسملؔ
مقفل ہے وہ چھوٹا بند پنجرہ

○

اک فرشتہ کہ نظر آتا ہے باہر میرے
ایک شیطان چھپا بیٹھا ہے اندر میرے

کس قدر مجھ سے مماثل ہیں خدوخال اُس کے

وہ جو اک شخص کہ بیٹھا ہے برابر میرے

نہ ملی آج تلک منزلِ مقصد تجھ کو
چھوڑ دے اب تو اکیلا مجھے رہبر میرے

حیلہ و مکر سے دشمن مرا پھر جیت گیا
پا بہ زنجیر کھڑے ہیں سبھی لشکر میرے

بیٹھنے ہی نہیں دیتی مجھے بے تابیِ دل
کب تلک ساتھ مرا دو گے مسافر میرے!

میں تہی دست کھڑا ہوں سرِ بازارِ وفا
چھن گئے مجھ سے سبھی لعل و جواہر میرے

میں کہاں تک سرِ میزانِ اَنا تُلتا رہوں
مجھ کو اب اذنِ رہائی دے ستمگر میرے

میں وہی بسملِؔ آشفتہ طبیعت ہوں، کہ تھا
عمر بھر ساتھ رہے بگڑے مقدر میرے

○

اک شخص کچھ نہ تھا تو مرا یارِ غار تھا
مسند نشیں ہوا تو مجھے بھول ہی گیا

اُڑنے لگا ہے اونچی ہواؤں میں دیکھیے

اک حادثے نے اس کا مقدر بدل دیا

پہچانتا نہیں ہے وہ اپنے پرائے کو
نشہ چڑھا ہے ایسا اُسے اقتدار کا

اوقات اپنی بھول گیا ہے وہ ایک دم
جیسے ہی اس کے سر پہ ہُما کا گزر ہوا

اس گلشنِ حیات میں فصلِ خزاں بھی ہے
رہتی نہیں ہے دوست !بہاریں یہاں سدا

اس بزمِ کائنات میں سب بے ثبات ہیں
مال ومنال ومنصب وعہدہ و مرتبہ

اُس کا غرور اُس کا تکبر کہاں گیا
اک شخص تجھ سے پہلے جو مسند نشین تھا

آئے جہاں میں جتنے بھی شاہانِ کج کلاہ
نام و نشان وقت نے سب کا مٹا دیا

○

لاریب کہ خود اپنے سے بے زار رہا ہوں
تیرا تو بہرحال طلب گار رہا ہوں

اوروں کے لیے باعثِ تسکیں تھی مری ذات
خود اپنے لیے موجبِ آزار رہا ہوں

کیوں تجھ کو تعجب ہے مری کم سخنی پر
اک عمر تغافل کا سزا وار رہا ہوں

اس وقت تو دامن مرا کانٹوں سے بھرا ہے
اے دوست! کبھی رونقِ گلزار رہا ہوں

○

آنکھیں بند کروں تو ایسا لگتا ہے

جیسے تو بھی پاس ہو بیٹھا، لگتا ہے

تیری یاد میں آنسو بہنے لگتے ہیں
پہلو میں اک درد سا اُٹھتا لگتا ہے

دل کی دھڑکن مدھم ہونے لگتی ہے
سانس لبوں پر جیسے اٹکا لگتا ہے

تیری صورت آنکھوں میں یوں نقش ہوئی
ہر اک چہرہ تیرا چہرہ لگتا ہے

تیرے دم سے یہ گھر کتنا روشن تھا
تیرے بعد ہر سُو اندھیارا لگتا ہے

تجھ کو چھوڑ کے جانے کی کیا جلدی تھی
روز کہاں دنیا کا میلہ لگتا ہے

شعروں میں احوال سناتا ہوں دل کا
لفظوں کا یہ کھیل بھی اچھا لگتا ہے

بسملؔ اب اس جینے میں کیا رکھا ہے
دنیا سے اب دل اُکتایا لگتا ہے

○

ہے بہت تلخ پر حقیقت ہے
زندگی موت کی امانت ہے

جھوٹ کہنا ہے اک گناہِ عظیم

سچ کا اظہار بھی مصیبت ہے

ہر گھڑی یا علیؑ علیؑ کہنا!
ہم ملنگوں کی یہ عبادت ہے

تم سے ہرجائی سے نباہ کیا
یہ ہماری وفا کی عظمت ہے

ہم سرِ حشر سرخرو ہوں گے
ہم کو مولا علیؑ سے نسبت ہے

○

بیتِ حوادث میں رہتا ہوں
ہردم وار نیا سہتا ہوں

درد جدائی کا سہتا ہوں

چپکے چپکے رو لیتا ہوں

زیست کے ٹھکرائے لوگوں کی
درد انگیز صدا سنتا ہوں

روشن مستقبل کی خاطر
کرب و بلا میں بھی زندہ ہوں

ظلم، تعدّی، ناانصافی
کیسے کیسے دکھ سہتا ہوں

کرتا ہوں غیروں کی شکایت
راہ میں کانٹے خود بوتا ہوں

دیکھتی ہیں جو میری آنکھیں
ساری باتیں کب لکھتا ہوں

جن کی پیشانی پر بل ہوں
اُن لوگوں سے کم ملتا ہوں

اہلِ غرض کی بھیڑ میں بسملؔ
میں تنہا، تنہا رہتا ہوں

○

دیکھتا رہتا ہوں پھر خواب سہانے شب بھر

یاد آتے ہیں بہت گزرے زمانے شب بھر

جیسے دیتا رہا دستک کوئی دروازے پر
آج سونے نہ دیا پگلی ہوا نے شب بھر

دور جنگل میں کوئی نالہ کناں تھا جیسے
مجھ کو بے چین رکھا ایک صدا نے شب بھر

دل بہل جاتا ہے جب چاند نکل آتا ہے
چاندنی گاتی ہے پھر گیت سہانے شب بھر

اکیلا تا بہ کے موجوں سے لڑتا
مجھے میرے قبیلے نے ڈبویا

تجھے بچھڑے ہوئے بیتا زمانہ
مگر بھولا نہیں تیرا سراپا

مرے محبوب کی ہو خیر یارب!
نہ جانے کیوں مرا دل آج دھڑکا

مہاجن کی تجوری بھر گئی ہے
اُٹھا کر لے گیا ہے سارا غلّہ

کسی بھی حال میں غیروں کے در پر
کبھی میں نے نہیں سر کو جھکایا

پلازے بن گئے شہروں میں بسملؔ
مرے دیہات کا نقشہ نہ بدلا

○

دعاؤں میں اثر آتا نہیں ہے
دلِ مضطر سکوں پاتا نہیں ہے

بچھڑتے جا رہے ہیں یار میرے
کوئی بھی دو گھڑی ٹکتا نہیں ہے

کرے جو میرے دردِ دل کا درماں
طبیب ایسا کوئی ملتا نہیں ہے

میں کن انجان لوگوں میں گھِرا ہوں
کوئی میری صدا سنتا نہیں ہے

پھنسا ہے تُند موجوں میں سفینہ
نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ہے

قبیلے نے جسے سردار مانا
وہ اپنے قول کا پکا نہیں ہے

○

دیکھ انھیں بھی ایک نظر
پھرتے ہیں جو خاک بسر

کوچہ کوچہ نگری نگری

دیس کے نغمے گایا کر

کیا تجھ کو معلوم نہیں
آزادی کے موقع پر
(ق)
کتنے گھر تاراج ہوئے
کتنے لوگ ہوئے بے گھر

کس نے کتنا کھویا ہے
پچھلی باتیں یاد نہ کر

تُو اپنی ناکامی کا
غیروں پہ الزام نہ دھر

پیدا کر اِک عزم نیا
اپنے دیس کی خدمت کر

○

اپنا نسب بدنام نہ کر
اے میرے نادان پسر

سچ ہے مردوں کا جوہر
جھوٹ کبھی نہ بولا کر

عہد شکن، عیار نہ بن

اپنا قول نبھایا کر

تُو میری آنکھوں کا نور
تُو ہے میرا لختِ جگر

اپنے کانوں سے بھی سن
اپنی آنکھ سے دیکھا کر

زیبِ تن اُجلے پوشاک
پھرتے ہیں یہ جادوگر

تیرا دشمن گھات میں ہے
دیکھ زمانے کے تیور

مطلب کے ہیں سارے یار
رکھتے ہیں سب زر پہ نظر

محنت کر کے جینا سیکھ
جیتے جی نہ بیٹھ کے مر

کیسے تجھے میں دکھلاؤں
کیسا تیر لگا دل پر

قاصر ہے اب میری زبان
دیکھ لے میری چشمِ تر

تیری کج فہمی سے اب
لگتا ہے دل پر نشتر

للہ میری باتیں سن
غور بھی کر اِن باتوں پر

دیکھ کہ بسملؔ دنیا سے
باندھ رہا ہے رختِ سفر

○

نہ جانے کب سے دھوکے کھا رہا ہوں

ترے ہی گیت پھر بھی گا رہا ہوں

تری صورت کو آنکھوں میں بسا کر
دلِ بے تاب کو بہلا رہا ہوں

کئی ارمان سینے میں چھپا کر
میں بحرِ غم میں ڈوبا جا رہا ہوں

تری محفل میں اب جی بھر گیا ہے
ہوئی ہے شام اب گھر جا رہا ہوں

بھرے بازار میں جو مجھ سے بچھڑا
اُسی کو ڈھونڈنے پھر جا رہا ہوں

کتابِ زندگی میں جو پڑھا ہے
سبق اشعار میں دوہرا رہا ہوں

اثاثے جو مرے اجداد کے تھے
میں اُن کو بیچ کر اب کھا رہا ہوں

○

سوچنے بیٹھوں تو پھر اک پل بھی جینا ہے محال
زندگی وہ ساغرِ سم ہے کہ پینا ہے محال

گوہرِ مقصود مل جائے یہ مشکل کام ہے
ڈھونڈ لینا شادمانی کا خزینہ ہے محال

جوش میں ہیں بحرِ حرص و آز کی امواجِ تُند
اب اُتر جائے کنارے پر سفینہ، ہے محال

اس قدر بگڑا ہے بسملؔ زندگانی کا چلن
نفرتوں کی چار دیواری میں جینا ہے محال

○

میرے دل کی دنیا ہے آباد سدا
اس میں مہکے گلشن تیری یادوں کا

اک مدت سے آنکھیں ہیں بے نور مری
خود کو دیکھے ایک زمانہ بیت گیا

اُن سے وصل کی ساعت ہے نزدیک بہت

میرے دل میں شوق کا ہے طوفان بپا

سب نے پہن رکھے ہیں ملبوسات نئے
پر معلوم نہیں ہے کس کا من اُجلا

آنکھوں میں منزل کی اک تصویر لیے
ایک مسافر چلتے چلتے بیٹھ گیا

تیری یاد میں، مَیں نے جو تحریر کیے
میرے وہ اشعار ہیں میرا سرمایہ

جوگی بن کراب جنگل میں پھرتا ہے
وہ جو اس بستی میں بسملؔ رہتا تھا

○

کس نے آنچل لہرایا ہے
خوشبو کا طوفان اُٹھا ہے

ہریالی ہے ہر سُو جیسے
سبزے کا اک فرش بچھا ہے

رُت رنگیلی جوبن پر ہے

غنچہ غنچہ چٹک رہا ہے
پھولوں پر منڈلاتا بھنورا
اپنی دُھن میں نغمہ سرا ہے

ڈالی ڈالی جھوم رہی ہے
پیلے پھولوں کا میلہ ہے
کھیتوں میں اور کھلیانوں میں
سونے کا انبار لگا ہے
سرسوں کے پھولوں کا بسملؔ
کھلنے کا انداز نیا ہے

ماں

رشتہ جو سب سے پیارا ہے
بسملؔ وہ ماں کا رشتہ ہے

جو بھی لفظ بڑائی کا ہے
بے شک وہ ماں پہ سجتا ہے

میں نے جو کچھ بھی پایا ہے

ماں کی دعاؤں کا صدقہ ہے
جب تک میری ماں زندہ ہے
مجھ کو دنیا سے ڈر کیا ہے
ماں گلشن میں رنگ ہوں جیسے
ہر رنگ جیسے بول رہا ہے
ماں بھینی بھینی خوشبو ہے
ماں جنت کی خنک ہوا ہے
ماں فردوس کی بہتی نہریں
جن میں میٹھا دودھ بھرا ہے
ماں تسکین کا ایک خزینہ
ماں خوشیوں کا گہوارہ ہے
زیست کی دھوپ میں میرے سر پر
ماں کی شفقت کا سایہ ہے
ماں ہے پیار کا بہتا دریا
ماں الفت کا سر چشمہ ہے
ماں اک سایہ دار شجر ہے

ماں پھولوں کی اک مالا ہے
ماں مہتاب سے بڑھ کر روشن
جیسے نور کا اک ہالہ ہے
کس نے برف زدہ راتوں میں
مجھ کو چھاتی سے ڈھانپا ہے
ماں بخشے ہر ایک خطا کو
گویا ماں کا دل دریا ہے

ماں کے قدموں میں جنت ہے
پاک نبیؐ نے فرمایا ہے
میں نے ماں کی گود میں پل کر
اپنے رب کو پہچانا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تلخاب

ادب نواز اور ادب پسند شخصیت

صاحبزادہ حسن نواز شاہ

اور

سردادساجد محمود خان

کے

نام

فرمانِ امیر علیہ السلام

ہے یہ فرمانِ علی المُرتضیٰ
یہ حقیقت اب بدل سکتی نہیں
چل تو سکتی ہے حکومت کُفر کی

سلطنت ظالم کی چل سکتی نہیں

○

یقین ہو تو شبِ انتظار کچھ بھی نہیں
جواں ہو عزم تو پھر جیت ہار کچھ بھی نہیں
ہو پاس تم تو بہاراں، نہیں تو فصلِ خزاں
وگرنہ اصلِ خزاں و بہار کچھ بھی نہیں

○

آؤ نا تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ
فُرصت کی یہ گھڑی کبھی شاید نہ مل سکے
باقی ہیں کتنے سانس نہیں اس کی کچھ خبر

ہم سے زیادہ لوگ تو اُس پار جا لیئے

○

یہ ہجرتوں کی کہانی، یہ رَت جگوں کا حساب!
ورق ورق مجھے ازبر ہے چاہتوں کا حساب
بھٹک رہا ہوں میں کب سے تلاشِ منزل میں
ہے کب تلک مجھے سہنا مُسافرت کا عذاب

ترقی کی حقیقت

آپ کہتے ہیں ترقی دیکھئے
مُلک کانٹے سے کھوٹہ ہو گیا
میں یہ کہتا ہوں کہ بیری کا درخت

کٹتے کٹتے اب بروٹہ ہو گیا

مقتل

ہر گلی کوچہ لہو سے لال ہے
سر کٹی لاشیں پڑی ہیں شہر میں
الحفیظ و الاماں کا شور ہے
آج کل شامیں کڑی ہیں شہر میں

آہ نثار

میں اس کی یاد کو دل سے بھلاؤں گا کیسے
وہ مجھ سے بچھڑا تو موسم بہار کا تھا وہ
نکھر گیا تھا کفن میں جو پھول کی مانند

تھا ماہتاب کہ چہرہ نثار کا تھا وہ

خُود احتسابی

گولڈن جُوبلی منائیں شوق سے
ہو مبارک آپ کو اہلِ وطن
ایک ساعت کے لیئے رُک جایئے
سوچیے اور دیکھئے اپنا چلن

خُود فریبی

امن کی چادر کے سائے میں حضور!
چھپ نہیں سکتی کبھی دہشت گردی
موند لو آنکھیں کبوتر کی طرح

ٹل نہیں سکتی مصیبت کی گھڑی

تب اور اب

اک زمانہ تھا کہ ہر اک اہلکار
متقی ہونے کی کھاتا تھا قسم
اب دیانت کا یہ عالم ہے کہ وہ
دھونس سے لیتا ہے رشوت کی رقم

گولڈن جُوبلی؛ عوام اور قرض

شاعری آساں نہیں پر آج کل
گولڈن جُوبلی پہ لکھنا فرض ہے
اپنا تن من دھن کرو قربان سب

اے عوام الناس تم پر قرض ہے

تھرو پراپر چینل

روز اخباروں میں پڑھتے ہیں کچھ ایسی سرخیاں
آپ کے سارے مسائل جیسے حل ہو جائیں گے
کل کچہری میں مجھے اک اردلی نے یُوں کہا
یہ, صاحب،سارے کام اب،میرے تھرو نمٹائیں گے

زندگی کی حقیقت

زندگی ہے ایک گڑیا کانچ کی
ایسی نازک چیز کا کیا اعتبار
ٹوٹ جائے اک ذرا ٹھوکر کے ساتھ

ایک ہی پل میں اُتر جائے خُمار

حقِّ نمک

آپ لمبی تان کر سو جایئے
اک نئے جذبے سے ہم پھر آئے ہیں
سنٹ پرسنٹ، اب کمشن کھائیں گے,
کل تلک رگڑے بھی ہم نے کھائے ہیں

جہانِ گذراں

ایک شہزادی دیارِ حُسن کی
شہرِ موسیقی کا تھا اک بادشاہ
نُصرت و لیڈی ڈیانہ بھی گئے

کون اس دنیا میں رہتا ہے سدا

روز و شب

وہی کوسوں سفر درپیش رہتا ہے اب بھی
میں بوڑھا ہو گیا ہُوں پر وہی دن رات ہیں میرے
شکایت ہے نہ شکوہ ہے کوئی اولاد سے بسملؔ
سلامت پاؤں ہیں میرے توانا ہات ہیں میرے

خیرات

میں بدنصیب ہُوں ایسا کہ میری چھاؤں میں
جو بیٹھتا ہے مجھے کاٹنے کی سوچتا ہے
ستم تو یہ ہے کہ اب کر کے لخت لخت مجھے

نگر نگر وہ مجھے بانٹنے کی سوچتا ہے

صُورتِ حالات

شہر در شہر تڑپتی لاشیں
آنکھ ہر روز یہ منظر دیکھے
وہ خُدا ہے تو زمیں پر اپنی
آسماں سے اُتر کر دیکھے

غمِ فراق

تجھ سے بچھڑا تو روزِ محشر تک
کیسی کیسی قیامتیں دیکھیں
مختصر تھیں وصال کی گھڑیاں

عمر بھر کی جُدائیاں دیکھیں

میگی میرٹھی کے نام

ختم ہوتے ہی نہیں یہ فاصلے
ہائے ہم بھی کس قدر مجبور ہیں
آپ کا عشرت کدہ ایبٹ آباد
ہم اسیرِ شہرِ کیمبلپور ہیں

ہائے نثار

چھوڑ کر مجھ کو تڑپتا کبھی سوچا بھی نہ تھا
تو چلا جائے گا تنہا کبھی سوچا بھی نہ تھا
ایک ہی پل میں اُجڑ جائے گا جانے سے تیرے

زندگانی کا یہ میلہ کبھی سوچا بھی نہ تھا

خیر مقدم

یہاں جو آیا تو سب نے خُوش آمدید کہا
چلا گیا، تو اُسی شخص کو پلید کہا
بدل گیا ہے ہمارا مزاج ہی بسملؔ
شبِ فراق کو ہم نے شبِ سعید کہا

دستورِ زمانہ

ہم نے دیکھا ہے اہلِ ثروت کو
لوگ جُھک کر سلام کرتے ہیں
اور ہم سے فقیر لوگوں سے

مُختصر سا کلام کرتے ہیں

یادِ گُجرات

بیتے ہوئے لمحات کہاں سے لاؤں
شعلہ سے وہ جذبات کہاں سے لاؤں
اِس سوچ میں بیٹھا ہوں جھکائے سر کو
روز و شبِ گجرات کہاں سے لاؤں

○

مُدت ہوئی ہے عدل کی زنجیر کٹ گئی
دہشت گری کے عہد میں جینا محال ہے

گلیوں میں کِشت و خون کا یہ کھیل تا بہ کے؟
اربابِ اختیار سے میرا سوال ہے

یادِ ماضی

ماضی کی میں اک تصویر بناتا ہوں
دل کی چوکھٹ میں اس کو لٹکاتا ہوں
چھوڑ کے جانے والے تب یاد آتے ہیں
دیکھ کے وہ تصویر بہت گھبراتا ہوں

آزادی اور زنجیر

وہ کہتے ہیں ہم نے سوچی اِک ایسی تدبیر
غاصب سے آزاد کرا لیں گے اپنا کشمیر

جنگ و جدال کی باتیں چھوڑو پھینک دو اب تلوار
آؤ بنائیں مل کر سارے ہاتھوں سے زنجیر

بَرنگِ دَگر

کوئی بچوں کا کھیل ہے یہ بھی
جو بناتے ہو ہاتھ سے زنجیر
زورِ بازوئے مُصطفیٰ کے بغیر
فتح ہو گی نہ وادیِ کشمیر

گولڈن جُوبلی ریل گاڑی

شہر کا ہر شخص اسٹیشن کی جانب ہے رواں
گولڈن جُوبلی کی ریل آئی ہمارے شہر میں

ہم نے سمجھا تھا کہ ریل آنے سے کم ہو جائے گی
ہے مگر زوروں پہ مہنگائی ہمارے شہر میں

دوسرا سوال

ہر شخص کو ہیں جان کے لالے پڑے ہوئے
دہشت گری کے خوف سے جینا محال ہے
سڑکوں پہ کشت و خون کا یہ کھیل تا بہ کے
اربابِ اختیار سے میرا سوال ہے

○

وہی مٹی ہے بسملؔ جو کبھی سونا اُگلتی تھی
مگر اس سر زمیں کو آج کل بنجر بھی کہتے ہیں

ہم اک آدھی صدی کے بعد بھی یارو ستم یہ ہے
اک ایسے گھر میں رہتے ہیں جسے کھنڈر بھی کہتے ہیں

○

زندگی مصیبت ہے، یہ کھلی حقیقت ہے
عمر بیت جاتی ہے، ایک گھر بنانے میں
ہم سفید پوشوں کا، حال پوچھتے ہو کیا
قرض لے کے زندہ ہیں آج کے زمانے میں

روز و شب

زندگی کا نشاں نہیں ملتا
روٹی، کپڑا، مکاں نہیں ملتا

ایسے بدلے ہیں روز وشب اپنے
چین پل بھر یہاں نہیں ملتا

تصویر اور جاگیر

کھوئی گئی جو مجھ سے وہ جاگیر مل گئی
دل آج کھل اُٹھا تیری تصویر مل گئی
برسوں شبِ سیہ میں بھٹکتا پھرا تھا میں
بدلا نصیب، صبح کی تنویر مل گئی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خواب میں جنگل

سردار باقر رضا خان

کے

نام

عظمتِ کعبہ

یقین ہے کہ یہی ہے مشیتِ کعبہ
گناہ گار بھی دیکھے عنایتِ کعبہ

مجھ ایسے بے سروساماں حقیر بندے کو
کشاں کشاں لیے پھرتی ہے الفتِ کعبہ

کرم یہ کم تو نہیں مجھ پہ ربِ کعبہ کا
کہ دیکھتا ہوں پھر اک بار رفعتِ کعبہ

لپٹ کے روتی ہے خلقت غلافِ کعبہ سے
سکونِ قلب و نظر ہے لطافتِ کعبہ

خدا کا گھر ہے تو بسملؔ علی کا گھر بھی ہے
قلم سے کیسے رقم ہو گی عظمتِ کعبہ

حریمِ کعبہ میں

تمام عمر پہ بھاری حریمِ کعبہ میں
جو رات رو کے گزاری حریمِ کعبہ میں

دماغ عرش پہ ہے اور سر ہے سجدے میں

عجب سرور ہے طاری حریمِ کعبہ میں

گناہ گار تھا میں گھر بُلا کے مولا نے
مری حیات سنواری حریمِ کعبہ میں

ہجومِ خلق ہے ہر سُو مگر کرم اُس کا
ہر ایک سمت ہے جاری حریمِ کعبہ میں

زبان و لہجہ و اندازِ گفتگو ہیں جدا
دعائیں ایک ہیں ساری حریمِ کعبہ میں

نہ جانے کتنے سلاطین جھولیاں پھیلائے
آئے ہیں بن کے بھکاری حریمِ کعبہ میں

کیا ارادہ طوافِ وداع کا جس دم
لگی ہے دل پہ کٹاری حریمِ کعبہ میں

سنائی دیتی ہے کانوں میں رات دن بسملؔ
صدائے گریہ و زاری حریمِ کعبہ میں

نعت رسول مقبول

شہرِ رسول میں غمِ ہجراں لیے ہوئے
آیا ہوں دل میں سینکڑوں ارماں لیے ہوئے

خوشبو رچی ہوئی ہے فضاؤں میں چار سُو
ہر اک نفس ہے یاں پہ گلستاں لیے ہوئے

دنیا میں ہر طرف شبِ ظلمت کا راج تھا
آپؐ آگئے ہیں صبحِ درخشاں لیے ہوئے

ہے محوِ خواب نازِ دوعالم کا تاجدار
بے کل دلوں کے چین کا ساماں لیے ہوئے

پروانہ وار آتے ہیں عشاق ہر گھڑی
صدقہ اتارنے کو دل و جاں لیے ہوئے

بیٹھا ہوا ہوں گنبدِ خضرا کے سائے میں
ہر درد سے نجات کا امکاں لیے ہوئے

لایا تھا اپنے ساتھ گناہوں کی گٹھڑیاں
اب جا رہا ہوں دولتِ ایماں لیے ہوئے

سجدہ میں سر ہے اور میری آنکھیں ہیں اشک بار
بسملؔ ہر ایک اشک ہے طوفاں لیے ہوئے

نعت

دل میں رسولِ پاک کی الفت لیے ہوئے
پھر جا رہا ہوں شوقِ زیارت لیے ہوئے

گردن جھکی ہوئی ہے گناہوں کے بار سے
آنکھوں میں اپنی اشکِ ندامت لیے ہوئے

بے مثل ہے ریاضِ نبی کا ہر اک شجر
ہر پھول ہے بلا کی نزاکت لیے ہوئے

رشکِ چمن ہے شہرِ مدینہ کی ہر گلی
ہر رہگذر ہے حسنِ لطافت لیے ہوئے

یہ بھی کرم ہے مجھ پہ رسولِ کریمؐ کا
میرا سخن ہے بحرِ فصاحت لیے ہوئے

بسملؔ کو ہے یقین کہ میدانِ حشر میں
آپؐ آئیں گے متاعِ شفاعت لیے ہوئے

نعت

تمام رات مدینے کے خواب دیکھتا ہوں
میں دل کے پاس مہکتے گلاب دیکھتا ہوں

ہجومِ درد میں عادت ہے میرے دل کا سکوں
نگاہِ لطف ہو مجھ پر ، جنابؐ دیکھتا ہوں

جو شخص ان کی شفاعت سے ہو گیا محروم
میں اس کے واسطے اندھا عذاب دیکھتا ہوں

کرم کرم مرے آقاؐ میں اک حریقِ گناہ
سوئے مدینہ بہ حالِ خراب دیکھتا ہوں

گزر ہی جائے گی ہجر و فراق کی گھڑیاں
بلائیں گے مجھے در پر جنابؐ دیکھتا ہوں

جہاں جہاں پہ قدم فخرِ انبیاء کے پڑے
وہیں، وہیں پہ کئی آفتاب دیکھتا ہوں

سما گیا مرے دل میں حضور کا جلوہ
میں اپنے دل میں کئی ماہ تاب دیکھتا ہوں

نعت

اعزاز کم نہیں ہے یہ میرے نصیب کا
سایہ ہے میرے سر پہ خدا کے حبیب کا

جس کو ملی نہ اُن کی شفاعت بروزِ حشر
دوزخ مقام کیوں نہ ہو اس بدنصیب کا

بیمار ہوں تو خاکِ مدینہ مرا علاج
محتاج میں نہیں ہوں کسی بھی طبیب کا

دو بار ہو چکا ہوں زیارت سے فیض یاب

بندہ ہوں آپؐ کا تو دھنی ہوں نصیب کا

ہر وقت ہے ہجومِ خلائق مزار پر
بسملؔ یہ معجزہ ہے خدا کے حبیب کا

نعت

ہے دن کو چین، نہ ہے رات کو قرار مجھے
حضورؐ در پہ بلاؤ پھر ایک بار مجھے

وہ عطر بیز ہوائیں وہ جاں فزا گلشن
ستا رہی ہے مدینے کی پھر بہار مجھے

مچل رہے ہیں جبینِ نیاز میں سجدے
رکھے ہے خاکِ درِ پاک بے قرار مجھے

نعت

جنوں میں خدا جانے کیا کہہ رہا ہوں
کہ خود کو رقیبِ خدا کہہ رہا ہوں

میں اک ذرۂ بے حقیقت ہوں لیکن
پہ جو کہہ رہا ہوں بجا کہہ رہا ہوں

ہے پیشِ نظر اُن کے روضے کی جالی
زباں سے فقط مرحبا کہہ رہا ہوں

مدینے کی رنگین و دلکش فضا کو
عجب کیا کہ عرشِ علیٰ کہہ رہا ہوں

عجب کیف و مستی کا عالم ہے بسملؔ
شب و روز صلِ علیٰ کہہ رہا ہوں

نعت

دل کش و دل نشیں نگینے کی
آؤ باتیں کریں مدینے کی

اُس کی بوباس کی مثال کہاں
بات جو آپؐ کے پسینے کی

جس میں تشریف آپؐ لائے ہیں
کیا فضیلت ہے اس مہینے کی

آپؐ کے خُلق کی ،دیانت کی
یہ ستائش تو دشمنوں نے کی

سخت مشکل میں بے سہاروں کی
دستگیری تو آپؐ ہی نے کی

بحرِ عصیاں سے پار اُتر جائے
خیر آقاؐ مرے سفینے کی

کاش! اک بار پھر حضوری ہو
اب تو حسرت یہی ہے جینے کی

سر کو جھکا کے ذات سے اپنی نکل کے چل
شہرِ رسولِ پاک میں بسملؔ سنبھل کے چل

آ کر درِ رسولؐ پر بنتی ہیں بگڑیاں
ہے شرط یہ کہ عجز کے سانچے میں ڈھل کے چل

کُشتۂ جور و جفا مولا حسینؑ

لب پہ اک حرفِ دعا مولا حسین
بے کسوں کا آسرا مولا حسین

جبر و استبداد کا مظہر یزید
صبر کی ہے انتہا مولا حسین

عزم واستقلال کا کوہِ گراں
پیکرِ صبر ورضا مولا حسین

اصغرِ معصوم کا چھلنی ہوا
تیرِ قاتل سے گلا مولا حسین

راکبِ دوشِ نبی تھا کل تلک
آج ہے بے دست و پا مولا حسین

گھر گیا ہے وحشیوں کے درمیاں
تاجدارِ کربلا مولا حسین

جاں نثار اُس کے سبھی قرباں ہوئے
ہائے تنہا ہوگیا مولا حسین

نوکِ نیزہ پر کیا اعلانِ حق
غیرِ حق پہ چھا گیا مولا حسین

دینِ حق تو بچ گیا لیکن ہوا
کُشتۂ جور و جفا مولا حسین

جل گئے خیمے ترے مرنے کے بعد

لٹ گیا ہے قافلہ مولا حسینؑ

آ گئی شامِ غریباں دشت میں
بیبیاں ہیں بے ردا مولا حسینؑ

پھر صف آرا ہے ہمارے سامنے
آج قومِ اشقیا مولا حسینؑ

ہے ہمارے رو برو ابنِ زیاد
دے ہمیں بھی حوصلہ مولا حسینؑ

بہہ رہا ہے بے گناہوں کا لہو
ہر گھڑی ہے کربلا مولا حسینؑ

بسملؔ عاجز پہ اک نظرِ کرم!
نام لیوا ہے ترا مولا حسینؑ

حسین کا نام

میری تقدیر ہے حسین کا نام
دل کی تنویر ہے حسین کا نام

اسم ہائے دعا ہیں پانچوں تن
ان میں تاثیر ہے حسین کا نام

خاکِ مقتل ہے جس کی خاکِ شفا
عجب اکسیر ہے حسین کا نام

بارغِ جنت ہے جس کے زیرِ نگیں
وہ جہانگیر ہے حسین کا نام

درسِ عبرت ہے آج نامِ یزید
وجۂ توقیر ہے حسین کا نام

حسرتیں ہیچ ہوگئیں بسملؔ
ایسی جاگیر ہے حسین کا نام

یا حسینؑ

ریاضِ آلِ عبا کا شباب بھی تُو ہے
سدا بہار مہکتا گلاب بھی تُو ہے

دیا ہے تُو نے زمانے کو درسِ قربانی
یقین و عزم و عمل کا نصاب بھی تُو ہے

پدر گرامی اگرچہ ہیں بابِ شہرِ علوم
اصولِ صدق و صفا کی کتاب بھی تُو ہے

یہ خاک و خون میں غلطاں دریدہ تن تیرا
جفا و جور و ستم کا جواب بھی تُو ہے

مچلتی دھوپ میں ننگے سروں، ملنگوں پر
ہوا ہے سایہ فگن وہ سحاب بھی تُو ہے

مجھ ایسے تیرہ نصیبوں کے واسطے ہر دم
پئے کرم جو کھلا ہے وہ باب بھی تُو ہے

پناہِ دیں کے لیے اور بقائے دیں کے لیے
کیا رسول نے جو انتخاب بھی تُو ہے

بپا ہوا تھا بصحرا بروزِ عاشورہ
لہو میں ڈوبا ہوا انقلاب بھی تُو ہے

ایک اک شاخ شعلہ فشاں ہوگئی
ہر کلی نذرِ برقِ تپاں ہوگئی

کس کی جادوگری کی یہ تاثیر ہے
ساری مخلوق کیوں بے زباں ہوگئی

کون دشمن ہے جس کی لگی ہے نظر
ہر خوشی بحرِ غم میں نہاں ہوگئی

چھن گئی ہر کسی سے متاعِ یقیں
ہر گھڑی نذرِ وہم و گماں ہو گئی

کتنا ارزاں ہوا آدمی کا لہو
زندگی کس قدر بے اماں ہو گئی

اَن گنت خواہشوں کے پجاری تھے
سب
بات آخر یہ سب پر عیاں ہو گئی

آج کی شب ہے بسملؔ پہ بھاری بہت
درد کی لہر دل میں جواں ہو گئی

○

صبح سویرے جتنے بھی اخبار پڑھے
شہر کی بربادی کے ہیں آثار، پڑھے

اُس نے ایسا لکھا ہے منشورِ وفا
میں اقرار پڑھوں اور وہ انکار پڑھے

کاش سلگتے دل کی وہ آواز سنے
کاش کبھی وہ جذبوں کا اظہار پڑھے

ایک ضمانت منزل تک لے جانے کی
میرا رہبر کاش، مرے افکار پڑھے

دل نے جن کی سچائی تسلیم نہ کی
ایسے بھی فرمان کئی ناچار پڑھے

جیتے جی وہ بھول نہ پائے گا بسملؔ
جس جس شخص نے بھی میرے اشعار پڑھے

○

تھا مرے نزدیک ہی دریا بہت
میں رہا پر عمر بھر پیاسا بہت

تہمتیں مجھ پر لگی ہیں بے حساب
میں بھی تیرے شہر میں گھوما بہت

حادثہ منزل پہ لے آیا مجھے

تھا وگرنہ یہ سفر لمبا بہت

اب کسے اُس رات کی آتی ہے یاد
چھت گری تھی جب ہوا چرچا بہت

تو نہ جانے کس گلی میں کھو گئی
زندگی !میں نے تجھے ڈھونڈا بہت

اپنا ماضی اُس کو یاد آتا نہیں
بادۂ شاہی میں ہے نشّہ بہت

ہوں پشیماں کھینچ کر زنجیرِ عدل
تھا ترے انصاف کا چرچا بہت

رات بھر سویا نہیں میں خوف سے
بچھوؤں نے خواب میں کاٹا بہت

تُو نے بسملؔ بیچ کر سب کھا لیا
تھا ترے اجداد کا ترکہ بہت

○

اک عمر بِتائی ہے جس گھر کو بنانے میں
احباب مرے اُس کو مصروف ہیں ڈھانے میں

وہ جس کی رفاقت میں گزری ہے حیات اپنی
سرگرمِ عمل ہے وہ اب مجھ کو مٹانے میں

کچھ کہہ بھی نہیں سکتا، چپ رہ بھی نہیں سکتا
اک راز ہے پوشیدہ اس دل کے خزانے میں

وہ وقت غنیمت ہے، اس عہدِ ستم گر میں
بسملؔ جو گزر جائے، ہنسنے اور ہنسانے میں

○

پھول بکھرے ہیں لالہ زاروں کے
لد گئے قافلے بہاروں کے

پھر وہی گرمئ ہوائے دشت
پھر وہ طوفاں اُٹھے شراروں کے

انقلابِ جہانِ تیرہ و تار
رنگ اُڑتے ہیں گلعذاروں کے

عصمتیں لٹ گئیں سرِ بازار
دام چکتے ہیں مہ پاروں کے

○

حُبِ زَر نے اُس کو اندھا کردیا
ورنہ وہ بھی آدمی تھا کام کا

دوستوں سے ہوگئی راہیں جدا

حرفِ حق کہنے کی پائی ہے سزا

کون اس دنیا میں رہتا ہے سدا
نام رہ جائے گا اچھا یا بُرا

موت کے بے رحم ہاتھوں نے کئی
چاند چہرے کر دیے ہم سے جدا

چھوڑ کر پُر پیچ راہوں میں مجھے
میرا رہبر، رہزنوں سے مل گیا

میں گرفتارِ رسومِ عاشقی
میرا مسلک ہے زمانے سے جدا

رسمِ اُلفت کا نبھانا عمر بھر
کام یہ بسملؔ بہت دشوار تھا

○

نئی راہوں میں چلنا سیکھنا ہے
جو رستے ہیں پرائے چھوڑنا ہے

خزاں کی رُت بدلتی جارہی ہے
بہاریں آرہی ہیں دیکھنا ہے

نئی اقدار رائج ہورہی ہیں
رسوماتِ کہن کو بھولنا ہے

سبھی سچے کوئی جھوٹا نہیں ہے
چمن کس نے اُجاڑا سوچنا ہے

میں کیا ہوں اور مرے اسلاف کیا تھے
مجھے ترکے میں کیا کیا چھوڑنا ہے

بلاؤں میں گھرا ہے گھرا ہمارا
بلاؤں کا ہمیں سر پھوڑنا ہے

○

میں اپنے گھر میں ہوں لیکن کچھ ایسا لگتا ہے
ہر ایک شخص مجھے اجنبی سا لگتا ہے

عجیب رنگ میں اب کے بہار آئی ہے
شجر ہر ایک یہاں سر بُریدہ لگتا ہے

دمِ وصال لگا ہے جدائی کا دھڑکا
یہ انبساط کا لمحہ انوکھا لگتا ہے

○

دل کی دھڑکن مدہم ہوتی جاتی ہے
عمر کی ڈوری اب کم ہوتی جاتی ہے

ہر اک شخص کی آنکھ میں خون اُتر آیا

زیست کی محفل برہم ہوتی جاتی ہے

موت کی ٹھنڈی سیج پہ اب سو جاؤں گا
جینے کی خواہش کم ہوتی جاتی ہے

○

عجب حال میں ہے طبیعت ہماری
ہمہ بے سکونی، ہمہ بے قراری

شبِ وصل میں بھی جدائی کا دھڑکا
اسی غم میں گزری شبِ وصل ساری

فریبِ نظر کے سوا کچھ نہیں ہے
یہ مسند نشینی، یہ پرہیزگاری

یہاں سارے اسرار کھلنے لگے ہیں
تیری بزم میں اب کہاں رازداری

وہی لوگ پہنچے ہیں منزل پہ جن کو
دیا تو نے پروانۂ راہداری

کبھی دن بڑا اور کبھی رات لمبی
ازل سے ہے فطرت کا یہ کھیل جاری

ہوئے محوِ حیرت ہیں سب اہلِ دانش

''تماشہ دکھا کر گیا ہے مداری''

سدا منفعت سے گریزاں رہا میں
نہ آئی مجھے راس تحصیل داری

نذرِ ناز

مرے خالق کا اک اعجاز ہو تم
نہ کھل پایا جو اب تک ،راز ہو تم

لبوں پر ہر گھڑی رقصاں تبسم
مسرت کا حسیں انداز ہو تم

تمھاری گفتگو میں اک کھنک ہے
کہ جیسے خوب صورت ساز ہو تم

تمھیں سروِچمن شرما کے دیکھے
وجاہت کا نیا انداز ہو تم

سرِ محفل تمھیں دیکھا ہے جب سے
مری خواہش مری آواز ہو تم

سرِ تسلیم کیوں کر خم نہ ہوگا
سراپا ناز ہو تم، ناز ہو تم

نہ ہو کیوں اپنی قسمت پر وہ نازاں
کہ جس کی ہمدم و دمساز ہو تم

○

وہ میری بچی
عدیلہ رانی
کہ جس کی صورت
ہے چاند کی سی

وہ جس کے لب ہیں
گلاب کی پنکھڑی کی مانند
کہ اُن شگفتہ لبوں پہ ہر دم
حسین و معصوم مسکراہٹ
کے پھول مہکیں
کہ جن کی خوشبو سے
ہے معطر دماغ میرا
وہ میری بچی
شریر و چنچل
کبھی وہ ''ججی''[۱] سے لڑ رہی ہے
کبھی وہ ''پپو''[۲] سے پٹ رہی ہے
بہ ایں ہمہ وہ سراپا اُلفت
مجھے بہت یاد آ رہی ہے

[۱] باقر
[۲] منزہ کلثوم

شیخالبِ دریا

اک گاؤں ہے چھوٹا سا جو دیکھا لبِ دریا
نام اس کا سبھی کہتے ہیں ''شیخالبِ دریا''[۱]

جہلم سے چلیں جانبِ کشمیر تو راہ میں

صدیوں سے ہے آباد یہ قصبہ لبِ دریا

سر پیٹتی موجیں ہیں، بپھرتی ہوئی لہریں
ہوتا ہے شب وروز تماشا لبِ دریا

سرسبز درختوں کے دل آویز نظارے
اُس پار ہے پھیلا ہوا بیلا لبِ دریا

لایا ہے اُٹھا کر اُسے بیلے سے کوئی شخص
رکھا ہے جو وہ دودھ کا مٹکا لبِ دریا

وہ شوخ حسینہ کہ ہے محوِ تماشا
یا چاند کا ٹکڑا کوئی اُترا لبِ دریا

مہینوال کی ونجلی کی صدا کانوں میں گونجی
اک لحظہ سکوں ہم نے جو پایا لبِ دریا

پھر چشمِ تصور نے دکھایا ہے وہ منظر
سہمی ہوئی سوہنی کا اُترنا لبِ دریا

دیتی ہیں سنائی مجھے سوہنی کی صدائیں
کیجیے گا نہ کچے پہ بھروسا لبِ دریا

بیٹھا ہوں اسی آس پہ بسملؔ لبِ دریا
اے کاش! میرا چاند اُترتا لبِ دریا

[۱] دریائے جہلم کے کنارے واقع ایک گاؤں کا نام

سالِ نو

امیدوں کا دیپ جلاؤ سال نیا ہے روشن روشن
دل سے یاس کا نقش مٹاؤ سال نیا ہے روشن روشن

ایک ہی گھر میں رہنے والو! کب تک خون بہاؤ گے
نفرت کی دیوار گراؤ سال نیا ہے روشن روشن

کوچہ کوچہ قریہ قریہ پیار کا مرہم عام کرو
مل جائیں گے سارے گھاؤ، سال نیا ہے روشن روشن

روش روش پہ رنگ بکھیرو کلی کلی میں خوشبو بھر دو
گلشن گلشن پھول اُگاؤ سال نیا ہے روشن روشن

سندھ، سرحد، پنج آب، بلوچستان سدا آباد رہیں
یہ نغمہ سب مل کے گاؤ، سال نیا ہے روشن روشن

جانے والے سال نے تم کو کیسے کیسے زخم دیے ہیں
ان یادوں کو بھول بھی جاؤ سال نیا ہے روشن روشن

ہجر کی ٹھنڈی آگ میں کب سے بسملؔ کا تن جلتا ہے
اب تو اس کو گلے لگاؤ، سال نیا ہے روشن روشن

کاروانِ حیات

یہ زندگی کا کارواں
کشاں کشاں کشاں کشاں

رواں دواں رواں دواں
کبھی یہاں کبھی وہاں
کبھی وہاں، کبھی یہاں
یہ زندگی کا کارواں
بڑے عجیب سلسلے

بہت مہیب مرحلے
قدم قدم پہ الجھنیں
قدم قدم رکاوٹیں
کبھی کبھی اداسیاں
کبھی ہیں کامرانیاں
کبھی نشیب میں سفر
کبھی فراز پر گزر
کبھی بلند قہقہے
کبھی ہیں پست سسکیاں
یہ لہلہاتی کھیتیاں
یہ پُر بہار وادیاں
روش روش چمن چمن
حسیں گلوں کا بانکپن
کبھی سلوکِ دوستاں
رہا مثالِ دشمناں
کبھی کبھی عدو نے ہم پہ

کی ہیں مہربانیاں
مگر یہ دورِ الاماں
کہ پھٹ پڑا ہے آسماں
حیات کی ہر ایک رہگذر
ہوئی دھواں دھواں
جہاں میں یوں چلی ہوا
مٹی تمیز خیر و شر
خود اپنی ذات میں
الجھ کے رہ گیا ہے ہر بشر
ستمگروں کے عہد میں
وفا جہاں سے اُٹھ گئی
کبھی جو بات ناروا تھی
آج وہ روا ہوئی
بہ ایں ہمہ رواں دواں
ہے زندگی کا کارواں
ازل سے لے کے آج تک

یہ کارواں رکا نہیں
بچھڑ گیا جو کارواں سے
پھر کبھی ملا نہیں

اعترافِ جرم

بحضورِ قائدِاعظمؒ

میرے قائد میرے محسن
تجھ پہ ہو اللہ کی رحمت
تُونے جبرو استبداد کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرایا
ظلم کی زنجیروں کو پل میں کاٹ دکھایا
مجھ کو قعرِ مذلت سے باہر لے آیا

فرشِ زمیں سے مجھ کو اٹھایا
اوجِ ثریا تک پہنچایا
ہندو اور انگریز کی محکومی سے میری جان چھڑائی
مجھ کو آزادی دلوائی
تُو نے پاکستان بنایا
راہِ وفا پر چلنے کی تلقین بھی کی تھی
اپنے ہم سفروں، بھائیوں سے
پیار و محبت کرنے کی تلقین بھی کی تھی
تُو نے دیا تھا درسِ محبت، تُو نے دیا تھا درسِ اُخوت
لیکن پیارے قائد
آج مجھے احساس ہوا ہے
آج مجھے انکار نہیں ہے
میں نے تیری پند و نصائح کی دولت سے
میں نے تیرے فکر و عمل کے سرمائے سے
اپنی ذات کو افضل جانا
اپنی ذات کے اندر میں محصور ہوا ہوں

میں اندھا ہوں میں بہرہ ہوں
میرے محسن میرے قائد، آج مجھے احساس ہوا ہے
میں نے اُخوت کا سرمایہ، اپنی ذات کی بھینٹ چڑھایا
میں پنجابی، سندھی، بلوچی، اور بنگالی کہلایا
میں نے اپنی اَنا کی خاطر ہاتھوں میں تلوار اُٹھائی
میں نے اپنے بھائی کا سر کاٹ دیا ہے
میں نے اپنے گھر کو لوٹ لیا ہے
میں ڈاکو ہوں، میں قاتل ہوں

بارِ ندامت سے میرا سر جھکا ہوا ہے
آج مرا گھر لٹا ہوا ہے
میرے قائد میرے محسن!!
تجھ پر ہو اللہ کی رحمت!!

۱۴/اگست ۱۹۸۲ء

دل میں اپنا درد چھپائے گیت وطن کے گاتا جا
قسمت جو بھی رنگ دکھائے گیت وطن کے گاتا جا

مستقبل کے خواب سہانے رات کو پیارے دیکھا کر
صبح غموں کا بوجھ اُٹھائے گیت وطن کے گاتا جا

غیروں کا کچھ خوف نہیں ہے، اپنوں سے دل ڈرتا ہے
گمراہوں کو راہ دکھائے گیت وطن کے گاتا جا

جن لوگوں نے اس مٹی میں بوئے بیج عداوت کے
دامن اپنا اُن سے بچائے گیت وطن کے گاتا جا

زر والوں نے لوٹا تجھ کو، زروالوں کی بات نہ کر
ناداروں کو ساتھ ملائے گیت وطن کے گاتا جا
ہر مظلوم کے بہتے آنسو پونچھ لے اپنے دامن سے
ظلم کا ہر اک نقش مٹائے گیت وطن کے گاتا جا

رات کی تاریکی ہے آخر صبح کا سورج نکلے گا
آشاؤں کے دیپ جلائے گیت وطن کے گاتا جا

گلشن، گلشن، خوشبو، خوشبو نور کا عالم چھایا ہے
ڈالی ڈالی پھول سجائے گیت وطن کے گاتا جا

سبز ہلالی پرچم اپنا اس کی شان نرالی ہے

آج یہی پرچم لہرائے گیت وطن کے گاتا جا

اس دھرتی سے پیار ہے تجھ کو اس دھرتی سے پیار نبھا
دیس پہ اپنے آنچ نہ آئے گیت وطن کے گاتا جا

بھول بھی جا حالات کی تلخی بسملؔ تو بھی آج کے دن
آزادی کا جشن منائے گیت وطن کے گاتا جا

بہار سے پہلے

ہری شاخوں کو لہرانے لگے ہیں
دلوں کو خوب بہلانے لگے ہیں

بڑی چاہت سے میں نے جو لگائے
وہ پودے اب نظر آنے لگے ہیں

ہوئی آراستہ بنجر زمینیں
شگوفے کھل کے مُسکانے لگے ہیں

بچھا ہے سبز غالیچہ زمیں پر
نشاناتِ بہار آنے لگے ہیں

فضا خوشبو سے مہکی جارہی ہے
مناظر آنکھ کو بھانے لگے ہیں

اُڑی پھرتی ہیں ڈاریں تیتروں کی
عنادل جھوم کر گانے لگے ہیں

رفیقِ کار تھے بسملؔ جو میرے
بہار آئی تو یاد آنے لگے ہیں

۲۸ رمئی یوم تکبیر

ایک لمبا سفر
راستہ پُرخطر
کارواں سُوئے منزل
رواں تھا مگر
اَن گنت مشکلیں
راہ روکے کھڑی تھیں

قدم بہ قدم!

چار سُو وحشتیں
شب کی تاریکیاں
آسماں پر کوئی بھی
ستارہ نہ تھا
ایسے پُر ہول ماحول
میں کون تھا
خوف سے جس کی
حالت پریشاں نہ تھی
غیر تو غیر تھے
اُن سے شکوہ ہی کیا
کوئی اپنا بھروسے
کے قابل نہ تھا
رہزنوں نے لٹیروں نے
لوٹا بہت
جان لیوا کئی حادثے بھی ہوئے

کارواں پھر بھی
چلتا رہا رات دن
وقت کے ساتھ
رہبر بدلتے گئے

پھر یکا یک
اندھیرے کی
چادر پھٹی
ایک درویش
ہاتھوں میں مشعل لیے
علم و حکمت کی شمشیر
کے ساتھ
قافلے کی حفاظت
کو آگے بڑھا
پھر دلوں میں
نیا عزم پیدا ہوا

نیم جاں قافلہ
سُوئے منزل بڑھا
اس طرح سے گزرتے
گئے روز و شب
پھر اُٹھائیس مئی
کا ہوا دن طلوع
دنیا والے ہوئے
بحرِ حیرت میں گم
دامنِ کوہِ چاغی
سے آئی صدا
اے خدا اے خدا!
تُو ہے سب سے بڑا
کوئی ثانی نہیں ہے
جہاں میں ترا
ربِ کون و مکاں
خالقِ دو جہاں

تیری حمد و ثنا
کس طرح ہو بیاں
تُو جو چاہے
تو قطرہ سمندر بنے
تُو نہ چاہے تو
پتّہ بھی ہلنے نہ پائے
اذن تیرا کرے
خاک کو کیمیا
تُو جو چاہے تو
ذرّہ بھی ایٹم بنے
مٹ گیا آن کی آن
میں کرّ و فر
اک دھماکہ ہوا
دب گئے اہلِ شر
آ گئی جوش میں
رحمتوں کی گھٹا

چھم چھما چھم چھما چھم
برسنے لگی
بارآور ہوا نخلِ اُمید بھی
بے یقینی کو اوجِ یقیں مل گیا
خشک چہروں پہ
لوٹ آئی پھر تازگی
نیم مُردہ دلوں
کو ملی زندگی
ایک دم چھٹ گئیں
شب کی تاریکیاں
ہوگئی صبحِ نو
چھا گئی روشنی
اک نئے موڑ پر
آ گئی زندگی
یومِ تکبیر یومِ تشکر بھی ہے
سر بسجدہ ہوئے اہلِ ایمان بھی

پھول پھر کھل اُٹھے گلشنِ پاک میں
دشمنوں کے عزائم ملے خاک میں

وعدہ

قائداعظمؒ کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر

محترم دوستو! محترم ساتھیو !
کچھ خبر ہے تمھیں آج ہم کس لیے
اس جگہ سب اکٹھے ہوئے ہیں
یہ تقریب قائد کی صد سالہ ہے

وہ بابائے ملت کہ جس نے ہمیں

ہم کہ محکوم تھے، ہم کہ مظلوم تھے
ہم کہ لاچار تھے ہم کہ مجبور تھے
ہم کہ جکڑے ہوئے تھے غلامی کی زنجیر میں
ہم کہ اغیار سے سال ہا سال تک
اپنے جور و ستم کا نشانہ بنایا ہمیں

ہم کہ زندہ تھے لیکن ہمیں اک عذابِ مسلسل میں ڈالا گیا تھا
ہم کہ اغیار نے برس ہا برس تک
ہم کو تحقیر و ذلت کی تاریکیوں میں مقید رکھا
ہم کہ دشتِ بلا میں بھٹکتے رہے برس ہا برس تک
اپنے حسنِ تدبر سے منزل پہ پہنچا دیا

محترم دوستو! محترم ساتھیو!
ہاں تو پھر آؤ تو آج اپنے گریباں میں جھانکو ذرا
اپنے کردار پر اپنے اعمال پر آج ڈالو ذرا اک نگاہ
تم کہ مزدور ہو، کارخانوں کو تم نے جلایا نہیں
تم کہ دہقان ہو، اپنی مٹی سے سونا اُگایا کبھی؟

تم کہ تجار ہو، تم نے ناجائز دولت کمائی نہیں؟
تم کہ زردار ہو، کیا زر و مال کے تم پجاری نہیں؟
تم کہ استاد ہو، درسگاہوں میں کیوں علم و حکمت کی شمعیں بجھائی گئیں
تم کہ منصف ہو، حاکم ہوا ے دوستو!
تم نے انصاف کے نام پر سینکڑوں بے گناہوں کو زنداں میں ڈالا نہیں؟

تم کہ شاعر ہو، عالم ہو، فنکار ہو
اپنے شعروں سے، اپنی تقاریر سے، اپنے فن سے دلوں میں عداوت کی بنیاد رکھی نہیں؟

تم کہ ہو رہنما، کشتیِ قوم کے تم کہ ہو ناخدا
تم نے کی ہے کبھی قوم کی رہنمائی صحیح سمت میں
کوٹھیوں کے لیے، پرمٹوں کے لیے
تم نے قومی خزانے کو لوٹا نہیں؟

عیش و عشرت کی خاطر شب و روز تم

مضطرب بھی رہے، مستعد بھی رہے
مکر کے، سازشوں کے، فریبوں کے چکر چلاتے رہے
قوم کے نام پر قوم کے مال پر
اپنے بے نام ایواں سجاتے رہے

محترم رہنماؤ، خدا کے لیے، اپنے اپنے گریباں میں جھانکو ذرا
تم نے اغیار سے مل کے اپنی انا کے لیے
چند روزہ حکومت کے لالچ میں اس خطۂ پاک کو
ظلم سے، جبر سے، سینہ زوری سے
دولخت کرتے ہوئے جانے کتنے ہی دریا لہو کے بہائے نہیں؟

کتنی ماؤں کے نورِ نظر چھن گئے
کتنی بہنوں کے کڑیل جواں بھائی مارے گئے
کتنی بیوائیں نوحہ بلب ہیں ابھی
کتنے معصوم، ان جان بچے ابھی
اپنے باپوں کی آمد کے ہیں منتظر
اُن کو کیا ہے خبر، جانے والے نہ اب آئیں گے لوٹ کر

محترم دوستو، محترم ساتھیو!
آج بھی وقت ہے
آؤ سب مل کے قائد سے وعدہ کریں
سازشوں کے نہ چکر چلائیں گے ہم
کارخانوں کو اب نہ جلائیں گے ہم
زورِ بازو سے، ہمت سے، محنت سے اب
اپنی مٹی سے سونا اگائیں گے ہم
درس گاہوں میں اب روشنی کے لیے
علم و حکمت کی شمعیں جلائیں گے ہم
آؤ سب مل کے قائد سے وعدہ کریں
پھر بفضلِ خدا خطۂ پاک کو
دوستو! رشکِ جنت بنائیں گے ہم
اپنے قائد سے وعدہ نبھائیں گے ہم

۱۹۷۶ء

واپسی کا منظر

آقائے خمینیؒ ایران تشریف لاتے ہیں
ایک مدت کے بعد
شہر میں سکون ہے
لوگ جوق در جوق
گھروں سے نکل رہے ہیں
انسانوں کا ہجوم ہوائی اڈہ
کی جانب بڑھ رہا ہے
چہروں پہ خوشی کی جھلک ہے

آنکھوں میں روشنی کی چمک ہے
لیکن
ایک انجانا خوف بھی طاری ہے
سڑکوں اور بازاروں میں بھیڑ ہے
ہر آنکھ اشک بار ہے
یہ آنسو ہیں خوشی کے
تشکر کے!
شہر کے سپاہی
بندوقیں کاندھوں پہ لٹکائے
سرگرمِ عمل ہیں اور
حیرت اور استعجاب کے ساتھ
ہجوم کی طرف دیکھ رہے ہیں
بچوں اور جوانوں اور بوڑھوں کے
تیور بدلے ہوئے ہیں
لوگ انتقام بھری نظروں سے شاہ کے کارندوں
کو دیکھ رہے ہیں
گولیوں کی تڑتڑاہٹ کب کی ختم ہوچکی ہے

توپوں کے دہانے بند ہو چکے ہیں
شہر پر گہرا سکوت طاری ہے
یکا یک
فضا میں طیارہ کی گڑگڑاہٹ گونجتی ہے
آنکھیں آسمان کی سمت اُٹھتی ہیں
طیارہ آہستہ آہستہ اُتر رہا ہے
لاکھوں انسان سانس روکے کھڑے ہیں
مجمع پر گہری خاموشی چھا گئی ہے
طیارہ اُتر چکا ہے اور
سیڑھی لگ چکی ہے
لوگوں کا تجسس اور بڑھتا ہے
سینوں میں دلوں کی دھڑکنیں
تیز ہو گئی ہیں
نگاہیں اب طیارہ کے دروازے
پر لگی ہوئی ہیں
اور دروازہ کھلتا ہے
ایک مردِ خدا

مثالِ شعرِ حکیمِ مشرق
نگاہ اونچی، کلامِ شیریں
تپش جگر میں
جبیں کشادہ
ہے کس قدر پُرجلال چہرہ
کہ عظمتوں کا وہ ایک
کوہِ گراں ہو جیسے
وقار اور تمکنت سے
اپنے قدم اُٹھائے
جہاز سے اب اُتر رہا ہے
وہ ایک ساعت
وہ ایک لمحہ!
مسرتوں کا امین لمحہ!
جہانِ کہن کے روز و شب کو
بدل گیا ہے
ہجوم قابو میں اب نہیں ہے
تو گونج اُٹھی فضا یکا یک

ہر اک زباں پر ہے ایک نعرہ

ہمارا رہبر
عظیم رہبر
خمینی رہبر!

۹ رفروری ۱۹۹۴ء
خانۂ فرہنگ ایران راولپنڈی

نوحۂ نثار

(ا)

فون کی گھنٹی بجی
اور
ایک پیغام ملا
اُڑ گیا باز
فلک کی جانب
کھو گیا دور خلاؤں میں کہیں
سطحِ دریا پہ اُٹھی لہر

سمندر میں گری
روشنی کا تھا جو مینار گھرا

(۲)

انگلیاں کانپ رہی ہیں میری
اور آنکھوں میں اُتر آئی ہے
ساون کی گھٹا
میں ابھی سوچ رہا ہوں کہ میں نوحہ اُس کا
کورے کاغذ میں لکھوں گا کیسے
دل میرا درد کی شدت سے پھٹا جاتا ہے
دفعتاً
ذہن میں کھل جاتی ہے یادوں کی کتاب
اور پھر گردشِ دوراں نے زقند ماری ہے، اُلٹی ایسی
ایک اک کر کے نظر آتے ہیں چالیس برس!
ایک نغمے سے فضا گونج اُٹھی
در و دیوار ہیں رقصاں رقصاں
ایک اک فرد قبیلے کا ہے شاداں، فرحاں

ایک ہل چل سی مچی ہے گھر میں
وجد میں جھوم رہے ہیں
سبھی خورد و کلاں
سج گیا گاؤں میں اک جشنِ طرب
بزمِ ہستی میں قدم
اس نے رکھا ہے پہلا
رشکِ مہتاب ہے چہرہ اس کا
اُس کی خوشبو سے معطر ہے فضا
موٹی، موٹی سی غلافی آنکھیں
اور ماتھے سے نکلتی ہوئی سورج کی شعاع
ہونٹ ایسے کہ فدا اُن پہ گلابی کلیاں
پھول سا اس کا بدن
جیسے دمکتا گلشن!
اور

(۳)

پھر وقت کو لگ جاتے ہیں پر

آنکھ جھپکی بھی نہ تھی

بیت گئے چالیس برس!

کتنی منحوس تھی شب

رات بھر خواب ڈراونے دیکھے

صبحِ دم خوف ہے دل پر طاری

چار سُو پھیل گئی تاریکی

کونج جو ڈار سے بچھڑی ہو کبھی

لوٹ کر پھر نہیں آتے دیکھی

ایک ہی پھول کھلا تھا جو سرِ شاخِ گلاب

وقت سے پہلے اُسے دستِ قضا نے توڑا

(۴)

منوں مٹی کے تلے

کتنے آرام سے آنکھیں موندے

ہائے وہ رشکِ قمر

آج ہے آسودۂ خاک کر گیا کتنی ہی آنکھیں نم ناک

آسماں سر پہ گرا اور زمیں شق ہوئی

اور کیا ہو گی قیامت کی گھڑی!

دل میرا درد کی شدت سے پھٹا جاتا ہے

اور آنکھوں میں اُتر آئی ہے ساون کی گھٹا

انگلیاں کانپ رہی ہیں میری

میں ابھی سوچ رہا ہوں کہ میں نوحہ اس ک

کورے کاغذ پہ لکھوں گا کیسے؟

۱۹/اپریل ۱۹۹۵ء

نثار کے لیے

ہوئے تمام کئی ماہ وسال آجاؤ
ہوا ہے اب میرا جینا محال آجاؤ

تلاش کرتی ہیں ہر سُو تجھے مری آنکھیں
بس اک نظر کا ہے تجھ سے سوال آجاؤ

زباں پہ رہتا ہے تیرا ہی نام صبح وشام
دلِ حزیں میں ہے تیرا خیال آجاؤ

میں اُس کی یاد کو دل سے بھلاؤں گا کیسے
وہ مجھ سے بچھڑا تو موسم بہار کا تھا وہ

نکھر گیا تھا کفن میں جو پھول کی مانند
تھا مہتاب کہ چہرہ نثار کا تھا وہ

○

میرے پیارے بچو!
میرے بچو میرے پیارے بچو!
ذرا ٹھہرو
میری باتیں سن لو
کس لیے رہتے ہو آمادۂ پیکار و دغا
اب میرے پاس تو
کچھ بھی نہیں
سرمایہ بچا
میں تو سمجھا تھا

کہ تم ہو میرا سرمایۂ زیست
میری پیری کا
سہارا تم ہو
میں اسی آس پہ جیتا رہا ہوں
میں نے ہر دن رات تمھاری خاطر
سخت محنت کی، مشقت کی تھی
چلچلاتی ہوئی دھوپ ہو یا
یخ بستہ ہوائیں، طوفاں
جتنے بھی تیر حوادث کے زمانے نے چلائے
میں نے وہ اپنے بدن پر روکے
اور تمھیں محفوظ رکھا!
میری خواہش تھی کہ تم زندہ کرو گے
میرے اسلاف کا نام!
اُن کی تابندہ روایات کو
سینے سے لگاؤ گے مگر
سخت مایوس کیا ہے تم نے

لفظ ایثار کے معنی بھی
تمھیں یاد نہیں
تم تو اخلاص و محبت کو
بھلا بیٹھے ہو
آخری بات بھی سن لو میری
مل کے بیٹھو گے تو عزت سے
رہو گے جگ میں
اب نہ رہنا کبھی آمادۂ پیکار و وغا
اب میرے پاس دعاؤں
کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے بچو! میرے پیارے بچو!

جشنِ آزادی

۱۴/اگست ۱۹۸۱ء

آج پھر مستی میں محوِ رقص ہیں سرو وسمن
گیت آزادی کے پھر گاتے ہیں مرغانِ چمن

چھٹ گئی تھیں عہدِ محکومی کی ساری ظلمتیں

مہرِ آزادی کی جب پھوٹی تھی اک پہلی کرن

ہر گلی کوچہ ہے خوشبو سے معطر آج پھر
پھول ہیں تازہ بہ تازہ انجمن در انجمن

گیت آزادی کے ہر اہلِ وطن کے لب پہ ہیں
آج ہر شاعر ہے ارضِ پاک کا محوِ سخن

مطمئن ہے شادماں ہے آج ہر پیروجواں
اب نہیں آئیں گے اس گھر میں کبھی رنج ومحن

تفرقے سارے دلوں سے اب مٹائے جائیں گے
نعرۂ توحید سے معمور ہو گا یہ چمن

اتحاد و اتحاد واتحاد و اتحاد
اب یہی جذبہ ہر اک سینے میں ہوگا موجزن

آج آزادی کا دن ہے آج ہے یومِ سعید
جشنِ آزادی مبارک ہو تمھیں اہلِ وطن

بڑھتے چلو

شکست و یاد کی ظلمت مٹا کے بڑھتے چلو
دلوں میں عزم کی شمعیں جلا کے بڑھتے چلو

اگرچہ سیکڑوں صبر آزما مراحل ہیں

رہِ حیات میں تم مسکرا کے بڑھتے چلو

ازل سے برسرِ پیکار حق سے ہے باطل
غرور وسطوتِ باطل مٹا کے بڑھتے چلو

خلوص ومہر و محبت، مروت وشفقت
دل ونظر میں یہ دولت بسا کے بڑھتے چلو

خدا کے واسطے فرقہ پرستیاں چھوڑو
رسولِ پاکؐ کا پرچم اُٹھا کے بڑھتے چلو

پئے خراجِ عقیدت حضورِ قائدِ قوم
سرِ نیاز کو اپنے جھکا کے بڑھتے چلو

''اُسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام''
کلامِ شاعرِ مشرق سنا کے بڑھتے چلو

وطن کی آن پہ کٹ جائے سر، جھکے نہ کبھی
وطن کی شان کو بسملؔ بڑھا کے بڑھتے چلو

○

میں ہوں وہ پھل دار شجر
لوگ جسے ماریں پتھر

دیکھا سب کا دامنِ تر
کیا منصف اور کیا رہبر

بیت گئے پچاس برس
بن پایا نہ اب تک گھر

بیٹھے ہیں اُمید لیے
جانے کب ہو ہم پہ نظر

کُنجی کس کے ہاتھ میں ہے
کون بدلتا ہے منظر

ہر سُو پھُن پھیلائے ناگ
کیسے ہوگی زیست بسر

بسملؔ رات کے پچھلے پہر
گزری باتیں یاد نہ کر

○

دنیا میں اکثر دیکھا ہے
غم انسان کو کھا جاتا ہے

ایسا مشکل وقت پڑا ہے
جینا اب دشوار ہوا ہے

لوٹ مار اور دہشت گردی
اب تو یہ معمول ہوا ہے

جھوٹ، فریب، ریا، مکاری

ان کی بزم میں سب چلتا ہے

میری مجبوری پر اکثر
مجھ کو اپنوں نے ٹوکا ہے

دونوں سرپٹ دوڑ رہے ہیں
کیا درجہ اور کیا پرجا ہے

میں ہوں ایسا راہی جس کا
رہبر، رستہ بھول گیا ہے

داد رسی اب کس سے چاہیں
منصف عدل سے بے بہرہ ہے

میں ہوں باسٹھ سال کا بسملؔ
میں نے بستر باندھ رکھا ہے

○

بند آنکھوں کے تماشا دیکھنا
اور اب دنیا میں ہے کیا دیکھنا

بے نیازی کا نتیجہ دیکھنا
رہ گیا ہے فرد اکیلا دیکھنا

کوچۂ دلدار میں اے دوستو!
میرے مرنے کا تماشا دیکھنا

لوٹ کر اک بار پھر آ جائے تُو
ہائے اس دل کی تمنا دیکھنا

کٹ گئی آخر شبِ تیرہ و تار
ہو رہا ہے اب سویرا دیکھنا

کھُل رہا ہے دیکھیے بابِ قفس
اُڑنے والا ہے پرندہ دیکھنا

اُس وفا دشمن سے اُمیدِ وفا
دل تو رکھتا ہے نتیجہ دیکھنا

بسملؔ ناشاد کا پھر رات دن
یادِ ماضی میں تڑپنا دیکھنا

○

دیکھنے میں فقیر ہیں ہم لوگ
دل کے لیکن امیر ہیں ہم لوگ

خود ہی صیاد بھی قفس بھی ہیں
اور خود ہی اسیر ہیں ہم لوگ

زندگی کی سیاہ راتوں میں
روشنی کی لکیر ہیں ہم لوگ

دشمنوں سے بھی پیار کرتے ہیں
دوستی کے سفیر ہیں ہم لوگ

جان دیتے ہیں،آن پر اپنی
کس قدر باضمیر ہیں ہم لوگ

تم بدل جاؤ ہم نہ بدلیں گے
ایک گہری لکیر ہیں ہم لوگ

آپ اپنی مثال ہیں بسملؔ
آپ اپنی نظیر ہیں ہم لوگ

(عید پر کہے گئے اشعار)

ایک اک کر کے پیاری عیدیں یاد آئیں
عید آئی تو ساری عیدیں یاد آئیں

عید جوانی کے سب سنگی یاد آئے
اُن کے ساتھ گزاری عیدیں یاد آئیں

اونچے پیڑ پہ ڈالے جھولے یاد آئے
چڑھتی پینگ ہلاری، عیدیں یاد آئیں

گاؤں کی چوپال کے میلے یاد آئے

پنگھٹ پہ پنہاڑی عیدیں یاد آئیں

اُٹھتی، الہڑ، مست، جوانی مٹیارن
رنگوں کی لشکاری، عیدیں یاد آئیں

یوں تو ہر اک بات کو بسملؔ بھول گیا
عید پہ، لیکن ساری عیدیں یاد آئیں

بیادِ نثار

بہاریں جب بھی آئیں گی
گھٹائیں جب بھی چھائیں گی
نظارے مسکرائیں گے
پرندے چہچہائیں گے
کھلیں گے پھول گلشن میں
صبا، خوشبو، بکھیرے گی
مجھے تم یاد آؤ گے
بہت ہی یاد آؤ گے

میں جب بھی سر جھکاؤں گا
میرے آئینۂ دل میں
تیری تصویر ابھرے گی

○

خوشبوؤں کی کتاب ہو جیسے
اس کا چہرہ گلاب ہو جیسے

تجھ سے بچھڑا تو یوں ہوا محسوس
تیرا ملنا بھی خواب ہو جیسے

پھول کیا کیا ملے ہیں مٹی میں
یہ جہاں بھی خراب ہو جیسے

ہر قدم پر ہے امتحان نیا
زندگانی عذاب ہو جیسے

تیری فرقت میں رات دن برسے
آنکھ میری سحاب ہو جیسے

○

بو گیا ہے نفرتوں کے بیج وہ میرے لیے
کاٹ کھانے کو ہے میرا گھر مرا آنگن مجھے

لے گیا ہے چھین کر ساری بہاریں اپنے ساتھ
دے گیا ہے بس فقط اُجڑا ہوا گلشن مجھے

جانبِ منزل چلا تھا میں بصد شوق وجنوں

دے گیا تاریکیاں رہبر کا مکر و فن مجھے

زندگانی ہو چکی ہے اب تو اتنی بے ثبات
دل کی ہر دھڑکن لگے ہیں آخری دھڑکن مجھے

○

بہار آئی ہے دل گھبرا رہا ہے
کوئی بچھڑا ہوا یاد آ رہا ہے

اُدھر تازہ شگوفے کھل رہے ہیں
اِدھر دل کا چمن مرجھا رہا ہے

اُدھر خوشبو سے مہکی ہیں فضائیں
اِدھر دم ہے کہ گھٹتا جا رہا ہے

وہ جو غنچہ دہن، شیریں سخن تھا
وہی رہ رہ کے دل تڑپا رہا ہے

نشاطِ زیست گھٹتی جارہی ہے
مگر غم ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے

عنادل کے چہکنے کی صدا پر
دلِ مضطر مچلتا جا رہا ہے

کسی کی منتظر ہیں میری آنکھیں
زمانہ ہے کہ بیتا جارہا ہے

نہ جانے کب ملے گا پھر وہ بسملؔ
بہاریں چھوڑ کر جو جارہا ہے

O

میں کہتا ہوں گھر کی حفاظت مشکل ہے
وہ کہتا ہے تو بھی کتنا پاگل ہے

دشمن کی توپوں کا رُخ کس جانب ہے
اُس کی آنکھ سے یہ منظر کیوں اوجھل ہے

غیر کی آنکھ میں جانے کیسا جادو ہے
ہر اک اس کے تیرِ نظر کا گھائل ہے

یہ بھی کیسے کیسے صدمے جھیل گیا
سوچتا ہوں پتھر ہے یا میرا دل ہے

کشتی ڈوب رہی ہے گہرے پانی میں
بسملؔ دریا پار اُترنا مشکل ہے

پیاری منزہ بیٹی کی رخصتی پر

تُو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے مرے دل کا سکون
تیرے چہرے کی صباحت صبح کے منظر میں ہے
تیرے کمرے میں بسی ہے تیری یادوں کی مہک
تُو نہیں تو ذکر تیرا ہر گھڑی اس گھر میں ہے

تیری قسمت کا ستارہ تاابد روشن رہے
اب تو بس یہ ہی دعا میرے دلِ مضطر میں ہے
تیرے ہونے سے ہوا ہے میرا گھر جنت نشاں
تُو نہیں تو ایک ویرانی سی میرے گھر میں ہے

○

تنوروں سے دھواں جس دم اُٹھا ہے
یہ منظر گاؤں کا اچھا لگا ہے

پرندے لوٹ آئے گھونسلوں میں
اندھیرا شام کا اب چھا چکا ہے

تھکا ہارا ہوا دن بھر کا ہاری

پلٹ کر کھیت سے گھر آ رہا ہے

خداوندا! کرم کر رزق میرا
کھلے کھیتوں میں بارش میں پڑا ہے

شبانہ روز محنت کی ہے پھر بھی
مقدر میں جو لکھا تھا ملا ہے
تہی دستی ہے دہقانوں کی قسمت
مہاجن سیم و زر سے کھیلتا ہے

جسے اپنا مسیحا میں نے جانا
وہ میرے درد سے ناآشنا ہے

زمینوں پر لگا ہے ٹیکس بھاری
کسانوں پر ستم کی ابتدا ہے

ہمیں بیٹھے ہیں رہ میں سر بہ زانو
زمانہ ہے کہ دوڑا جارہا ہے

تصور میں جما لیتا ہوں محفل

مرا یاروں سے گہرا رابطہ ہے

میں یادوں کے سہارے جی رہا ہوں
میرا انداز دنیا سے جدا ہے

کہا میں نے یہ کوٹھی، کار، درباں
کہا اُس نے کہ پیسہ بولتا ہے

ہوئی ہے شام سورج ڈھل چکا ہے
مسافر لوٹ کر گھر جارہا ہے

مصائب سے وہ گھبراتے نہیں ہیں
جنھیں بسملؔ خدا کا آسرا ہے

○

اندر باہر ایک ہی جیسا لگتا ہے
سارا منظر ایک ہی جیسا لگتا ہے

اس کا دل ہو یا بت ہو بت خانے میں
ہر اک پتھر ایک ہی جیسا لگتا ہے

جادو نگری ہے ہم جس میں رہتے ہیں
فرش و منبر ایک ہی جیسا لگتا ہے

حرص و ہوس کی اندھی بہری دنیا میں
رہزن ،رہبر ایک ہی جیسا لگتا ہے

ہر اک اپنے قد سے اونچا اُٹھتا ہے
سارا لشکر ایک ہی جیسا لگتا ہے

○

تجھ سے جو بھی نظر ملاتا ہے
اپنی اوقات بھول جاتا ہے

بھول تھی جو تجھے کہا اپنا
تُو بھلا کب کسی کا بنتا ہے

ہم نے مانگی تھی روشنی لیکن
ظلمتِ شب نے آن گھیرا ہے

حبِ دولت میں ہوش کس کو ہے
کون ادنیٰ ہے کون اعلیٰ ہے

ہم بھی زندہ ہیں کوفیوں کی طرح
بے وفائی ہمارا شیوہ ہے

دل میں خوفِ یزید رکھتے ہیں
لب پہ نامِ حسینؓ رہتا ہے

ہم وہ پتھر ہیں راہ کے جن سے
منزلوں کا سراغ ملتا ہے

کارگاہِ حیات میں بسملؔ
مکر کا کاروبار چلتا ہے

○

رکھتا ہے کون سب کی خبر اقتدار میں
آتا نہیں ہے کچھ بھی نظر اقتدار میں

رکھتے نہیں تمیز کچھ اپنے پرائے کی
رہتی ہے منفعت پہ نظر اقتدار میں

چھینا ہے ہم نے دھوپ میں اس ایک شخص سے
ہر ایک سایۂ دار شجر اقتدار میں

میزان اُس کے ہاتھ میں آئی تو دیکھیے
اب اس کو خوف ہے نہ خطر اقتدار میں

سونا پڑے گا اب اُسے کانٹوں کی سیج پر
دشوار ہو گیا ہے سفر اقتدار میں

بسملؔ بھی تھا شریکِ سفر اس کا کل تلک
لیکن جدا ہے اس کا سفر اقتدار میں

○

البم آج پرانا دیکھا
جیسے خواب سہانا دیکھا

گزرا ہوا زمانہ دیکھا

ہنسنا اور ہنسانا دیکھا

گلشن گلشن غنچے دیکھے
پھر اُن کا مرجھانا دیکھا

بزم تھی جن کے نام سے قائم
بزم سے ان کا جانا دیکھا

اشعار اور قطعات

مختصر تھیں وصال کی گھڑیاں
عمر بھر کی جدائیاں دیکھیں

دھوکے ہیں سبھی تری نظر کے
آثار نہیں ہیں یہ سحر کے

کاسۂ دل بے نیاز آرزو کیسے کروں
جب تلک زندہ ہوں ترکِ جستجو کیسے کروں

نامۂ اعمال تھامے عرصۂ محشر میں ہوں
سوچتا ہوں خود کو اُن کے روبرو کیسے کروں

خیال و وہم و گماں سے نکل گیا آگے
یہ دور تیر و کماں سے نکل گیا آگے

حیات گردشِ پیہم کا نام ہے بسملؔ
بچھڑ کے ملنا ہے اور مل کے پھر بچھڑنا ہے
روشنی آنکھوں سے ہونٹوں سے ہنسی
چھین لی ہے گردشِ حالات نے
بستیاں ویراں ہیں اُجڑے ہیں دِیار
خوب ڈھایا ہے ستم برسات نے

لاکھ انھیں ہم ڈھونڈیں بسملؔ لیکن کب مل پاتے ہیں
کیسے کیسے چاند سے چہرے مٹی میں مل جاتے ہیں

کھڑا ہوں اب سرِ بازارِ ہستی اس بھروسے

پر

نظر آئے تری صورت مگر یہ ہو نہیں سکتا

رات گزرے گئی کس طرح بسملؔ
دن تو کاٹا خدا خدا کرکے

قصرِ شہی میں رنگ بھی رعنائیاں بھی ہیں
لیکن وہیں پہ دار کی رسوائیاں بھی ہیں
ہنگامہ ہائے عہد جوانی ہوئے تمام
پر اس میں رت جگے بھی ہیں تنہائیاں بھی ہیں

سب کچھ دیا ہے اس نے یہ دامن نہیں بھرا
مجھ کم نصیب کو ہے شکایت قسیم سے
پنہاں ہیں میرے دل میں کئی خواہشیں ابھی
ہر وقت مانگتا بھی ہوں ربِ کریم سے

حالِ غم اپنا سناؤں کس طرح
زخم سینے کے دکھاؤں کس طرح
قتل گاہیں بن گئی ہیں مسجدیں
گولڈن جوبلی مناؤں کس طرح

اس میرے گھر میں یوں تو اُجالا کبھی نہ تھا
پر اتنا خوفناک اندھیرا کبھی نہ تھا

پھر دلِ ناشاد تڑپانے لگا
یاد پھر اُن کی جوانی آ گئی

یہ مدقوق چہرے یہ لاغر تن وجاں
میرے گاؤں کے کیسے کیسے ہیں عنواں

کب سے لب بستہ ہے بسملؔ تُو یہاں
اُٹھ! کوئی نوحہ، کوئی نغمہ سنا

ہمیں ہوتے ہیں بسملؔ جانِ محفل
ہمارے دم قدم سے رونقیں ہیں

واجب القتل ہمیں ٹھہرے ہیں بسملؔ ورنہ
غیر بھی اس کی پرستش کا سزاوار تو تھا

دل کی حالت کا ذکر کیا کیجے
جانے کب تک چراغ جلتا ہے

تقاضا وقت کا ہے اہلِ گلشن
بچاؤ آبرو مل کے چمن کی
تیرے انصاف کی دھومیں مچی ہیں
مجھے بھی گوہرِ مقصود دے دے

دریدہ دامنِ دل سی رہا ہوں
لہو اپنا مسلسل پی رہا ہوں
میرا جینا بھی کیا جینا ہے بسملؔ

دواؤں کے سہارے جی رہا ہوں

انسانیت کی حرمت پامال ہوئی
شہر میں ہر اک شخص کو پاگل دیکھا ہے
ہر سُو وحشت ناک مناظر دیکھے ہیں
بسملؔ میں نے خواب میں جنگل دیکھا ہے

رہی نہ بزم، نہ باقی ،نہ بادۂ گلگوں
جو سانس باقی ہیں بسملؔ انھی کے نام کریں
کسے خبر ہے کہاں ٹوٹ جائے ساغرِ زیست
اُٹھو کہ جشنِ بہاراں کا اہتمام کریں

زندگی کی طویل راہوں میں
کاش ایسا بھی اک مقام آئے
آدمی، آدمی کا درد سنے
آدمی، آدمی کے کام آئے

پھرائے رکھتی ہیں مجھ کو نگر نگر آنکھیں

تلاش کرتی ہیں کس کو لہو سے تر آنکھیں
تمام عمر جسے یاد کر کے روئے گا
پڑا ہے قبر میں بسملؔ وہ موند کر آنکھیں

خیرات دے کے وہ مرا کشکول بھر گیا
لیکن میں اپنی موت سے پہلے ہی مر گیا
بادل ہیں سارے اس کے تصرف میں ان
دنوں
سرسبز کھیتیوں کو مری خشک کر گیا

عید ہے نام تیرے ملنے کا
تو نہیں پاس تو خوشی کیا ہے
رنگ رنگ پھولوں میں
صبح و شام گلشن میں
تتلیاں پکڑنے کا
وہ زمانہ اچھا تھا

سانس لینا بھی اب ہوا دشوار
بے اماں آسمان کے نیچے
ایک مدت سے لوگ زندہ ہیں
دھوپ کے سائبان کے نیچے

ٹوٹی چھت کے مکان میں گزری
سعیِ رائیگان میں گزری
ہم نہ اوجِ کمال تک پہنچے
زندگی امتحان میں گزری

برا تھا جو اُسے اچھا کہا ہے
یہ اپنی بے بسی کی انتہا ہے
چلن اس کا زمانے سے جدا ہے
خدا جانے وہ بندہ ہے، خدا ہے
ہیں اک مدت سے پیاسے میرے بچے
مرا گھر ہے یا دشتِ کربلا ہے

جو ہو سکے تو کچھ ایسا بھی اہتمام کریں
جئیں تو ساتھ جیئیں اور مریں تو ساتھ مریں

لحد میں حشر تلک دونوں محوِ خواب رہیں
بپا ہو حشر تو ہاتھوں میں لے کے ہاتھ اُٹھیں

ہجومِ رنج و غم میں کھکھلا کر ہنس لیتے ہیں
ہم اپنے درد کو دل میں چھپا کر ہنس لیتے ہیں

جو اہلِ درد کا درماں نہ بن سکے بسملؔ
کمال ہے کہ وہی بے نظیر کہلائے

تنہائی میں اکثر ایسا ہوتا ہے
تیری یاد میں تیرا بسملؔ روتا ہے

وہ ایک لمحہ سکوں کا گراں ہے صدیوں پر
ہوا جو آج مجھے تیرے قرب سے حاصل

پھرتے ہیں ہزاروں دیوانے
کوئی کیا سمجھے کوئی کیا جانے
جس نے دیکھا مدہوش ہوا
آنکھیں ہیں تری دو پیمانے

زمانے کی نگاہوں سے بچا کر
تیری آنکھیں سرِ محفل چرالوں
دلِ بے تاب کی یہ آرزو ہے
تری آنکھوں کو اس دل میں چھپالوں

تیری آنکھیں جہانِ کیف و مستی

تیری آنکھوں میں پنہاں رازِ ہستی
تری مخمور آنکھوں کے تصدق
ہوا میں قائلِ بادہ پرستی

ناز و نعم میں ہیں پلی لیلیٰ علی ہالہ علی
ان سے ہے گھر روشنی لیلیٰ علی ہالہ علی
ہے دعا بٹیا[ا] میری جیتی رہے پھولے پھلے
جُگ جُگ جیئیں فرحت علی ،لیلیٰ علی ہالہ علی

[ا]منزہ

(سردار فتح خان ڈھرنال کی وفات کی خبر سننے پر)

ہے انتہائے تغافل کہ بے خودی ہے مری
کٹے ہے بازو مرا اور خبر نہ ہو مجھ کو

ملک بشیر احمد اعوان اسسٹنٹ کمشنر کے لیے

بے راہ روی کی تو نے کلائی مروڑ دی
یہ حسنِ انتظام و تدبر کمال ہے
بگڑے ہوئے سماج کے کس بل دیئے نکال
اعوان تیرا عزم و عمل بے مثال ہے